پانچ موتی





پانچ دِل کش کہانیوں

کا

دِل نواز مجموعہ







سعید لخت

پانچ موتی

لڑکے اور لڑکیوں کے لیے

دلچسپ کہانیاں

سعید لخت

۱۹۴۷

فہرست

کتاب کے متعلق

پانچ موتی، پانچ دلکش اور اچھوتی کہانیوں کا دِلنواز مجموعہ ہے جس میں لکھنے والے نے اپنی تمام ذہنی کاوشیں نچوڑ کر رکھ دی ہیں۔ پانچوں کہانیاں جدید طرزِ تحریر اور ترقی یافتہ اسلوب نگارش کی مظہر ہیں۔ اور جدید ادب میں اپنا ایک الگ مُقام رکھتی ہیں۔

آیئے ان پانچ موتیوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھیں۔

ا. آہ خزانہ ایک بالکل اچھوٹی اور جدید طرز کی کہانی ہے جس میں ایک وہمی اور خبطی نوجوان کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے جس نے محنت مشقت کی زندگی چھوڑ کر خیالی اور وہمی دنیا آباد کی، اور کسی غیبی امداد کے بھروسہ پر مال دار بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ مگر اس وقت جب کہ اس کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ آخری ہلکورے لے کر بجھنے والا تھا، خوش قسمتی نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے خوابوں کی بستی

سے نکل کر پھر محمل دنیا میں قدم رکھا اور اپنی محنت مشقت سے جلد ہی مال دار بن گیا۔

۲. موجوں کی شہزادی ''کند ہم جنس باہم پرواز'' کی منہ بولتی مثال ہے۔ شیدو نامی ایک نوجوان مچھیرا کسی مچھلی لڑکی کو پکڑ کر گھر لے آتا ہے۔ اور اس سے شادی کر لیتا ہے۔ تین سال تک وہ بڑے پیار و محبت سے رہتے ہیں۔ اور بظاہر موجوں کی شہزادی سمندر کی دنیا بالکل فراموش کر دیتی ہے مگر ایک دن وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں سمندر میں اُتر جاتی ہے اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ وُہ وہی موجوں کی شہزادی ہے۔ وہ کسی کی بیوی نہیں، کسی کی ماں نہیں، نہ تو وہ کبھی زمین پر گئی، اور نہ اس نے کبھی کسی آدم زاد سے شادی کی۔ وہ سمندر کی بیٹی ہے اور سمندر میں ہی رہے گی اور بس! ہمت، جرأت اور استقلال، یہ اوصاف ہیں جو بڑی سے بڑی مصیبتوں اور آفتوں کو حل کر دیتے ہیں۔

۳. تیسرا موتی ''پریوں کی پہاڑی'' ایک ایسے ہی نڈر، بہادر اور مُستقل

مزاج نوجوان کی کہانی ہے جس نے اپنی شجاعت اور ثابت قدمی سے پریوں کی ملکہ کو نیچا دکھایا۔ اور اس کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔

۴. ”گدڑی کا لال“ ایک غریب بیوہ کے لڑکے کی عجیب و غریب آپ بیتی ہے جو اپنی ہونہاری، عقلمندی اور دلیری سے معمولی ملّاح سے ہسپانیہ کا بادشاہ بن گیا۔

۵. ”قسمت کا چکر“ ایک شہزادے کی دکھ بھری کہانی ہے جس نے طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر گوہرِ قصور حاصل کیا۔

یہ ہیں پانچ موتی، جن میں ہر ایک اپنی آب و تاب، چمک دمک اور اچھوتے پن میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ زبان، پلاٹ اور طرز بیان ترقّی یافتہ ہے۔ زبان کی سیاست کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ کہانیوں کا یہ مجموعہ کافی پسند کیا جائے گا!

آہ! خزانہ

نِیرا ایک غریب کسان تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ کُچھ جانور تھے۔ رہنے کے لیے ایک کچّا مکان بھی تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اُس کی محنت، دیانت داری اور خوش مزاجی کی تعریف کرتے اور آج تک کسی کے مُنہ سے اس کے خلاف کوئی شکایت سُننے میں نہ آئی تھی۔ یہ بھی نیرا کی خوش قسمتی ہی سمجھو کہ جیسا وُہ خود زندہ دِل اور سیدھا سادا سا جوان تھا ویسی ہی اس کی بیوی نُورا ہنس مُکھ اور سُگھڑ لڑکی تھی۔ وُہ نِیرا کے ساتھ ہنسی خوشی رہتی اور اپنے غریب شوہر سے کبھی کسی چیز کی شکایت نہیں کرتی۔

اسی طرح ہنستے کھیلتے دِن گزر رہے تھے کہ یکایک نِیرا میں تبدیلی آنی شروع ہُو گئی۔ اب وُہ کھیت کی رکھوالی اور جانوروں کی دیکھ بھال کے بجائے گھٹنوں میں سر دے کر گھنٹوں کُچھ سوچا کرتا۔ رات کو عجیب و غریب خواب دیکھتا۔ کبھی دیکھتا کہ

وُہ کھیت کھود رہا ہے کہ اچانک اُس کی کُدال لوہے کی کسی دیگ سے ٹکرائی اور اس نے زمین کھود کر اُسے باہر نکالا تو وُہ مُنہ تک سونے سے بھری ہُوئی تھی۔ کبھی دیکھتا کہ آسمان سے روپوں کی بارش ہو رہی ہے اور وُہ انہیں بٹور رہا ہے۔ غرض اسی طرح کے خواب تھے جو اسے رات دن دکھائی دیتے تھے۔

ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑے جلالی بزُرگ اس سے کہہ رہے ہیں کہ گاؤں کی شمالی جانب دریا کے کنارے جو نتھو دھوبی کی بنجر زمین پڑی ہے اس میں ایک بُہت بڑا خزانہ گڑا ہے۔ جاؤ ہم تجھے بخشتے ہیں۔ مگر خبر دار اُسے کسی بُرے کام میں صرف نہ کرنا۔

نِیرا یہ خواب دیکھ کر مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ پاس ہی چارپائی پر نُورا سو رہی تھی۔ اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا اور آنکھیں اور حلق دونوں چھاڑ کر بولا۔ ”اری نُورا، ہم امیّر ہو گئے۔ ہم مال دار ہو گئے۔ آہاہاہا۔ اب ہمیں محنت مزدوری نہیں کرنا پڑے گی۔ اب ہم بھی تحصیل دار کی طرح ایک شان دار کوٹھی میں رہا کریں گے۔ سینکڑوں نوکر ہُوں گے۔ ہزاروں جانور ہُوں گے۔ بس سمجھ لے نحوست

کے دِن ختم ہو گئے اور عیش کے دن آ گئے۔ آہا میرے بزرگ، میں کس مُنہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم تو سچ مُچ ولی اللہ ہو۔ نُورا تو اب کی جمعرات کو اُس بزرگ کی فاتحہ ضرور دِلانا۔ کیا سمجھی؟ اب ہم کِسی کے دبیل نہیں۔"

نُورا بُہت دِنوں سے اپنے شوہر کی بدلی ہُوئی حالت دیکھ رہی تھی اور جی ہی جی میں کُڑھ رہی تھی۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور جھنجھلا کر بولی۔ "خاک پڑے اس دولت پہ۔ ایک مہینے سے سُن رہی ہُوں مگر ابھی تک تو ایک پھوٹی کوڑی بھی ہاتھ نہیں آئی۔ میں کہتی ہُوں تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ نہ کام کے نہ دھام کے۔ دن رات پڑے پڑے جھُوٹے سچّے خواب دیکھا کرتے ہو (نقل بنا کر) نُورا ہم امیر ہو گئے۔ نُورا ہم وُہ ہو گئے۔ نُورا ہم یہ ہو گئے۔ ہُوں۔۔۔۔"

نِیرا کو بڑا بُرا معلُوم ہُوا۔ جھڑک کر بولا۔ "اری تو گنواری کیا جانے قسمت کسے کہتے ہیں اور تقدیر کِس چڑیا کا نام ہے، تو نے بچپن میں کہانیوں میں کبھی نہیں سُنا کہ کسی پری نے ایک غریب آدمی کو پل بھر میں امیر بنا دیا یا کوئی بھِک منگا سڑک پر ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا، نیچے نظر جھکا کر سڑک پر جو دیکھا تو ہزار ہزار روپے کے

نوٹ پڑے تھے۔ خُدا دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کیا خبر کسی دِن ہم بھی ایسے ہی بیٹھے بٹھائے امیر ہو جائیں۔ مگر تُجھے کون سمجھائے جاہل۔"

"ہاں میں تو جاہل ہُوں۔" نُورا چادر تان کر بولی۔ "مگر اِتنا ضرور جانتی ہوں کہ ایسی باتیں صِرف کہانیوں ہی میں ہوتی ہیں۔ آج تک ہم نے سُنا نہیں کہ کِسی کو کہیں سے خزانہ مِل گیا ہو۔ میں کہتی ہوں اب سوتے بھی ہو یا ننھّے کو اُٹھا کر ہی دم لوگے؟"

"کیا کہا خزانہ؟" نِیرا کو صرف ایک ہی دُھن تھی وہ پہلی باتیں سُنی ان سُنی کر کے بولا۔ "اری پگلی یہی تو بتانے لگا ہوں۔ مگر تُو نے بھی۔ ابھی ابھی خواب میں ایک بزرگ آئے تھے فرماتے تھے کہ۔۔۔"

"کہ کل سے تُم بھنگیوں کے جمعدار ہو جاؤ گے۔" نُورا ہنس کر بولی۔

نِیرا غصّے میں اکڑ کر بیٹھ گیا اور مُٹھی بند کر کے بولا۔ "بھنگیوں کا جمعدار؟ اری کم بخت خزانہ۔ وُہ کہتے تھے کہ گاؤں کے شمالی جانب دریا کے کنارے۔۔۔۔"



اور نُورا نے جب ساری کہانی سُن لی تو دانت پیس کر بولی۔ ستیا ناس جائے اِن کلمُوہی خوابوں کا میں کل ہی پیر جھنڈے شاہ کے پاس جا کر کوئی تعویذ لاؤں گی۔ جانے کِس کم بخت نے تُم پر جادُو کر دیا ہے۔ مہینہ بھر پہلے اچھّے خاصے تھے۔ گھر کو گھر، بیوی کو بیوی اور بچّے کو بچّہ سمجھتے تھے مگر اب دماغ ہی بدل گیا ہے۔ ذرا سوچو تو اگر اِسی طرح لوگوں کو خزانے مِل جایا کریں تو سارے لوگ کام کاج چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ محنت کرو تو شاید مال دار ہو جاؤ۔ اس طرح خواب دیکھنے سے تو فاقے مرو گے، ساتھ ہی مُجھے اور اِس ننھّی سی جان کو بھی مارو گے۔"

نِیرا تَن فَن ہو کر بولا۔ "لعنت ہو تم پر اور تمہارے جھنڈے پیر پر۔ مُجھے بھی کیا سُوجھی کہ تجھ سے ذکر کر دیا۔ بندر کیا جانے ادرک کی سار؟ تُجھے تو جب یقین آئے گا جب میں سچ مُچ دولت مند ہو جاؤں گا۔ پھر دیکھوں گا تُو کِس طرح مُجھ سے کہتی ہے کہ وہ لا دو یہ لا دو۔"

"مت لا کر دینا۔" نُورا اُنگلی نچا کر بولی۔ "مُجھے گِری پڑی مُفت کی دولت نہیں

چاہیے۔ میرا بیٹا بڑا ہو کر کما کر لائے گا اور میں عیش کروں گی۔ جہنّم میں جائے تمہارا خزانہ۔ فضُول کی باتیں۔"

"سو جا۔۔۔" نِیرا جھِڑک کر بولا۔ اس نے سوچا اس کے مُنہ کون لگے۔ جاہل ہے یہ تو۔ رات بھر وُہی خزانہ اُس کی آنکھوں میں پھرتا رہا۔ اُسے وہ رات کاٹنی دو بھر ہو گئی۔ جانے کب صُبح ہو گئی اور کب وہ جا کر خزانہ کھودے گا۔ جِس زمین کا پتا بزُرگ نے نِیرا کو بتایا تھا وہ نتھّو دھوبی کی تھی جسے مرے ہوئے بیس برس ہو گئے تھے اور وہ اب اُس کے نکھٹّو بیٹے کے قبضے میں تھی۔ بیس سال سے اُس میں ہل نہیں چلا تھا اور اس میں بڑی بڑی جھاڑیاں اور کانٹوں والی جنگلی بیریاں اُگ آئی تھیں۔ کوئی شخص یہ زمین خریدنے کو تیّار نہ تھا۔ مالک کو اِتنی فُرصت نہ تھی کہ وُہ خُود اس میں کھیتی باڑی کرتا۔

نِیرا نے آتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی جوتی بوئی زرخیز زمین دے کر نتھّو کے بیٹے سے وہ بنجر اور جھاڑ جھنکار بھری زمین لے لی۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ نتھّو کا بیٹا سمجھا کہ نِیرا کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا وہ اُس سے مذاق کر رہا ہے

مگر جب اُس نے چار بھلے آدمیوں کے سامنے لکھا پڑھی کرا دی تو اُسے اِطمینان ہُوا۔

نُورا نے خاموشی سے اپنے شوُہر کی کارستانی دیکھی اور خون کے گھونٹ پی کر چُپ ہو گئی۔ کِسے سمجھاتی اور کون سُنتا؟ نِیرا کو تو بزُرگ کی بات کا اتنا یقین تھا کہ نُورا سر بھی پٹک کر مر جاتی تو وہ ایک نہ سُنتا۔ کہنے سُننے سے فائدہ؟

اُسی دِن جِس دِن نِیرا نے اس بنجر زمین پر قبضہ کیا، وُہ چپ چاپ پھاوڑا کاندھے پر رکھ کر گھر سے نِکل گیا اور اللہ کا نام لے کر زمین کھودنی شروع کر دی۔ جوان آدمی، ہاتھ پیروں میں طاقت، چوڑی چھاتی، بھرے بھرے مضبُوط بازُو۔ تین گھنٹے ہی میں اچھّی خاصی زمین کھود ڈالی مگر خزانے کا کہیں پتا نہ چلا۔ اُس نے سوچا شاید یہ جگہ نہ ہو بلکہ اِس کے پاس والی جگہ ہو۔ وہ اُسے چھوڑ کر اُس جگہ پر پِل پڑا اور آن کی آن میں اُسے بھی کھود کر پھینک دیا۔ لیکن افسوس خزانہ یہاں بھی نہ تھا۔ جب شام ہو گئی تو تھک ہار کر گھر آ گیا۔ حیران تھا کہ کیا مُعاملہ ہے۔ کیا اُس کا خواب جھُوتا تھا؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنے دِنوں میں تو امیر بننے کی اُمّید ہوئی

تھی۔ کیا یہ یونہی مِلیامیٹ ہو جائے گی؟ کبھی نہیں۔ کل پھر کوشش کروں گا۔

نیرا صُبح کو اُٹھا تو نُورا اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بولی۔ "لاؤ۔۔۔"

"کیا؟" اُس نے حیرانی سے پُوچھا۔

"خزانہ اور کیا؟" وہ ہنسی روک کر بولی۔ "میں ننّھے کے لئے کھلونے منگاؤں گی۔"

نیر کے دِل میں آیا کہ نُورا کی بچّی کو کچّا ہی چبا جائے۔ اُونھ یہ میرا مذاق اُڑاتی ہے۔

"دیکھ میں تیرا بُہت خیال کرتا ہوں۔" وہ غرّا کر بولا۔ خزانہ کیا لڈّو پیڑا ہے کہ تیرے ہاتھ پر رکھ دُوں؟"

نُورا ایک دم پھٹ پڑی۔ غضب خُدا کا، عقل ماری گئی ہے۔ ایک تو اِتنی اچھّی زمین کھوئی اور اب اِس بنجر زمین پر ناحق مغزمار رہے ہو۔ میں کہتی ہوں جتنی محنت کل رات تُم نے اس زمین پر کی اگر کسی کے کھیت میں کرتے تو دو چار روپے ہاتھ آ جاتے۔ ہُوں! خزانہ ملے گا انہیں۔ صُورت تو دیکھو خزانہ ملنے والوں کی۔"

"اچھّا بابا مُعاف کر۔" نِیرا عاجز آکر بولا۔ "جا اپنا کام کر۔ جب خزانہ مِل جائے گا تو میری صُورت دیکھ لینا۔"

نُورا روتی دھوتی کام دھندے میں لگ گئی اور نِیرا پھاوڑا اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ آج اُس نے کل سے بھی زیادہ محنت کی اور پانچ چھ جھاڑیاں کھود کر ہی دم لیا لیکن جب گھر لوٹا تو خالی ہاتھ تھا۔ اسی طرح وہ پندرہ دن تک زمین کھودتا رہا۔ گاؤں والے سمجھ رہے تھے کہ نِیرا اس میں غلّہ بوئے گا۔ نُورا سمجھ رہی تھی کہ فضُول کوشش کر رہا ہے اور نِیرا سوچ رہا تھا کہ آج نہیں تو کل، کسی دِن تو ضرور ہی وہ خزانے کی کھنکھناتی ہوئی آواز سُنے گا۔

ایک دن وہ صُبح ہی سے کھُدائی میں مشغول تھا۔ شام ہو گئی تھی مگر وہ برابر پھاوڑا چلائے جا رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بس یہ آخری دن ہے، آج خزانہ مل گیا تو خیر ورنہ یہیں سر پھوڑ کر مر جائے گا کہ یکایک اُس کا پھاوڑا ایک سخت پتھّر سے ٹکرا کر اُچٹ گیا۔ بڑے زور کی آواز آئی۔ اُس کے مُنہ سے خُوشی کی چیخ نِکل گئی۔ "خزانہ۔ آہ۔ خزانہ۔ دولت۔ روپیہ۔ چاندی۔ مگر یہ آواز کیسی؟"

اُس نے پھر سے کان لگایا تو ایسا معلُوم ہوا جیسے بُہت سے آدمی آپس میں کانا پھُوسی کر رہے ہیں۔

"یہ نیرا شرارت سے باز نہیں آئے گا۔" اس نے سُنا کوئی کہہ رہا تھا۔

"میرے خیال میں۔" دوسرا بولا۔ "ہمیں اِسے پکڑ کر تالاب میں ڈال دینا چاہیے۔ مگر مچھوں کو خوراک مل جائے گی۔ ہاہاہا۔"

"بد بخت۔ ضدّی۔" تیسرے نے غصّے سے کہا۔ اگر اِس نے اس طرح ہمارے سر پر پھاوڑا چلایا تو میں باہر نِکل کر اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

"ٹھہرو۔" پہلے نے کہا۔ "میرے دماغ میں ایک بڑی اچھّی تدبیر آئی ہے۔"

نِیرا چُپ چاپ سانس روکے اُن لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُس کا دِل دھک دھک کر رہا تھا مگر چہرے سے مسرّت ٹپک رہی تھی۔ بہت دِنوں سے اُس کے خواب کی تعبیر نِکلی تھی۔ وہ اسی طرح مُنہ کے بل لیٹا کان لگائے سُن گُن لیتا رہا۔

"اب کیا کروں؟" جب آوازیں تھم گئیں تو اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”ٹھہرو۔ یہ لوگ یہاں سے ہٹ جائیں تو اندر گھسوں۔ اور پھر خزانہ۔ اے خُدا۔“ اس نے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں خُدا کا شکریہ ادا کیا جس نے اُسے بے شمار دولت کا مالک بنا دیا تھا اور دِل ہی دِل میں آنے والے زمانے کے خواب دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے پاس دولت ہو گی۔ بُہت سی زمینیں، لاتعداد جانور۔ پھر وہ بھی گاؤں کے زمین دار کی طرح بگھّی میں بیٹھ کر ہوا خوری کو نِکلا کرے گا۔

وُہ اسی طرح پڑے پڑے خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ قبرستان کا سا سنّاٹا اور اس ہولناک سنّاٹے میں بس اُس کی سانس چل رہی تھی یا دِل دھڑک رہا تھا۔

سیکنڈ۔۔۔ منٹ۔۔۔ گھنٹا۔۔۔ دو گھنٹے۔ اب وُہ بے قرار ہو گیا۔ اگر آج بھی ناکام گھر لوٹا تو نُورا ضرُور مُجھے گھر سے نِکال دے گی۔ خزانہ میرے قدموں میں پڑا ہے۔ صرف ذرا سی ہمّت کی ضرورت ہے۔ وُہ جلدی سے اُٹھا اور پھاوڑے کی ایک ہی ضرب سے پتھّر کو باہر نِکال پھینکا۔ اُس کے سامنے ایک غار تھا۔ گہرا اور تاریک۔ اور پھر اُسے ایسا محسوس ہُوا جیسے کسی نے اُسے دھکّا دے دیا۔ اور وُہ

لڑھکنیاں کھاتا ہُوا اوندھے مُنہ اُس غار میں گر پڑا۔

غار میں اندھیرا گھُپ تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ اُونچائی سے گرنے کی وجہ سے نیرا کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی تھی اور وُہ درد کے مارے تڑپ رہا تھا۔ اچانک اُسے ایسا معلُوم ہُوا جیسے بہُت سے بھُوت پریت خوفناک آوازوں میں کوئی گیت گاتے ہوئے اُس کے گرد ناچ رہے ہیں۔ انتہائی ڈر اور خوف کی وجہ سے اُس کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ دانت سے دانت بجنے لگے اور سارا جسم تھر تھرانے لگا۔ وُہ بڑی عاجزی سے گڑ گڑا کر بولا۔ ”خ خ خدا کے لیے۔۔۔ مُجھے نہ مارو۔۔۔۔ میں تو تو توبہ کرتا ہُوں۔۔۔ آیندہ کبھی۔۔۔ بھو بھولے سے بھی۔۔۔ یہاں نہ آؤں گا۔۔۔ میری بی بیوی۔۔۔ میرے پیچھے مر جائے گی۔ میرا ان ن ننّھا۔“

کِسی نے اُس کے بال پکڑ کر اُٹھا کر بٹھا دیا۔ نیرا پھر رو کر بولا۔ ”میں۔۔۔ منّت کرتا ہوں۔۔۔ مُجھے چھوڑ دو۔ میرے پاس ایک گھ گھ گھوڑا اور ایک بھینس ہے جو پندرہ سیر دُودھ دیتی ہے۔ یہ سب لے لو مگر مُجھے چھوڑ دو۔“

پھر اُسے بہُت سے قدموں کی آواز سُنائی دی جیسے ہزار ہا آدمی اِدھر اُدھر چل پھر

رہے ہوں۔ جونہی وُہ خاموش ہُوا سارا غار ان گنت قہقہوں سے گونج اُٹھا۔

”آنکھیں بند کرو۔“ کسی نے اُس سے نرمی سے کہا۔ اُس نے جھٹ آنکھیں میچ لیں۔ ”اب کھول دو۔“ آواز آئی اور اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ وُہ ایک آراستہ پیراستہ محل میں بیٹھا ہے اور اُس کے گرد ہزاروں پریاں اور پری زاد کھڑے اُسے گھُور گھُور کر دیکھ رہے ہیں۔

ایک عورت جو صورت شکل اور لباس سے پریوں کی ملکہ معلُوم ہوتی تھی آگے بڑھ کر بولی۔ اگرچہ تم اِس قابل ہو کہ تمہیں فوراً پھانسی پر چڑھا دیا جائے مگر چونکہ ابھی تم نے کہا ہے کہ تمہارا ایک ننّھا سا بچّہ ہے اور ایک بیوی ہے۔“

”جی ہاں نُورا۔۔۔ نُورا اُس کا نام ہے۔“ نیرا نے جلدی سے کہا۔ اِس پر پریوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

”خیر۔ اُس کا نام کُچھ بھی ہُوا۔“ ملکہ مُسکرا کر بولی۔ ”اس لیے ہم تمہاری جان بخشی کرتے ہیں۔ مگر خبردار۔ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ سمجھے؟ اب جاؤ۔“

نِیرا کی اُمّیدوں کا بنا بنایا قلعہ دھڑام سے گِر پڑا۔ وُہ جلدی سے ملکہ کے قدموں میں جھُک کر بولا۔ ''حضور والا، میں بچپن سے آپ لوگوں کے مُتعلّق سُنتا آیا ہوں کہ آپ کی قوم بڑی سخی اور رحم دِل ہُوتی ہے اور وُہ پل بھر میں غریبوں کو امیر بنا دیتی ہے۔ حضور، برسوں سے میں امیر بننے کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں امیر کیوں نہ ہوا؟ میرے پاس دولت کیوں نہ ہوئی؟ سارا سارا دن اور ساری ساری رات انہی فِکروں میں گھُلتا رہتا کہ کوئی پری مُجھے مِل جائے یا کہیں سے خزانہ ہاتھ آ جائے۔ آج اِتنی مُدّت کے بعد آپ سے ملاقات ہُوئی مگر افسوس جو میں سمجھتا تھا وُہ نہ ہوا۔

ملکہ بڑی شفقت سے بولی۔ ''اچھّا تو تم دولت چاہتے ہو؟ آؤ میرے ساتھ۔''

وُہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے خزانے میں لے گئی اور بولی۔ ''لو، جتنے ہیرے جراہرات، سونا چاندی تم اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو۔۔۔'' اور نیرا نے اپنی قمیص اُتار کر خوب ٹھونس ٹھونس کر ہیرے جواہرات اس میں بھر لِیے اور باہر نِکل آیا۔

پری اُسے حیرت سے دیکھ کر بولی۔ ''مگر تُم اتنی دولت کا کیا کرو گے؟''

"کیا کروں گا۔" نِیرا خوشی سے ناچ کر بولا۔ "میں یہ سب دولت لے جا کر نُورا کے قدموں میں ڈال دوں گا جو مُجھے وہمی اور خبطی سمجھتی ہے اور سینہ تان کر کہوں گا کہ بے وقوف تُو مُجھے دیوانہ اور خبطی سمجھتی تھی۔ لے یہ دیکھ۔ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ جائیں گی اور جلدی سے سارے ہیرے سمیٹ لے گی۔ پھر ہم اپنے ٹوٹے پھُوٹے مکان کو چھوڑ کر ندی کے کنارے کوٹھی بنا لیں گے اور نہایت سکون اور اطمینان سے پڑے عیش کریں گے۔"

"اچھّا تو اب تم آنکھیں بند کر لو۔" پری اُس کی ساری کتھّا سُن کر بولی۔ نِیرا نے گٹھڑی کو مضبُوطی سے پکڑ کے جھٹ آنکھیں بند کر لیں اور پَل بھر میں غار سے باہر نِکل آیا۔

جب نِیرا نے آنکھیں کھولیں تو سُورج نِکل چُکا تھا اور وُہ اپنے کھودے ہُوئے غار کے مُنہ پر پڑا تھا۔ رات بھر پھاوڑا چلانے کی وجہ سے ہاتھ اکڑ گئے تھے اور جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ وُہ آہستہ آہستہ کراہتا ہوا اُٹھا۔ سامنے نُورا ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لِیے بُت بنی کھڑی تھی۔



"کون نُورا؟" وُہ چلّا کر بولا۔

"ہاں نُورا۔" وُہ تڑخ کر بولی۔ "غضب خُدا کا۔ اب یہاں تک نوبت آگئی کہ رات رات بھر گھر سے غائب رہنے لگے۔ خزانہ، خزانہ، دولت، دولت۔ میں کہتی ہُوں کہیں یہ دولت کا بھُوت ایک دِن تمہاری جان لے کر نہ چھوڑے۔"

"ارے رے رے۔" نِیرا اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اِتنی زور سے مت چیخو۔ بس تم میں یہی عادت تو بُری ہے کہ پُوری بات سُنے بغیر چیخنا شروع کر دیتی ہو۔ ذرا میری بھی تو سُنو۔"

"سُنوں کیا خاک؟" نُورا ڈنڈا زمین پر مار کر بولی۔ "رات بھر پڑے یہاں جھک مارتے رہے۔ میں حیران تھی کہ خدا معلُوم کیا ہو گیا۔ کیوں گھر نہیں آئے۔ حرام ہے جو ساری رات پلک سے پلک لگی ہو۔ (رو کر) میں آج ہی اپنے گھر جا رہی ہوں۔"

بیوی کو روتا دیکھ کر نِیرا کا دِل بھر آیا۔ جلدی سے اُٹھا کہ پریوں کے دیے ہُوئے ہیرے جواہرات اُس کے آگے پھینک دے۔ مگر ایں؟ وُہ گٹھڑی کہاں گئی؟ وُہ

قمیص کہاں گی جس میں ہیرے جواہرت باندھے تھے؟ اسے دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے دیکھ کر نُورا ہنس پڑی۔ بولی ''یہ دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟''

نِیرا جل بھُن کر کباب ہو گیا۔ پیر پٹخ کر بولا۔ اپنا کلیجا ڈھونڈ رہا ہوں۔ اری نیک بخت رات پریوں نے مُجھے ہیرے جواہرات دیے تھے۔ وُہ نہ جانے کِدھر گئے؟''

''قمیص کی جیبوں میں دیکھو۔''نُورا ہنس کر بولی۔

نِیرا جھلّا کر بولا۔ ''کون سی جیبوں میں دیکھوں؟ قمیص میں ہی تو میں نے وُہ ہیرے باندھے تھے۔ اِتنے سارے ہیرے بھلا جیبوں میں کیسے آتے؟ دیکھ نُورا اگر تُونے وہ گٹھڑی لی ہُو تو سنبھال کر رکھنا۔ ہاں، دولت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔'' ''ہائے۔۔۔'' نُورا سر پکڑ کر دھم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اب دماغ بھی خراب ہو گیا؟ ارے اللہ کے بندے قمیص تو تُو پہنے ہوئے ہے۔ ہیرے کاہے میں باندھے تھے۔ میرے سر میں؟''

"ٹن ٹناٹن ٹھنانانانانانانانانانا۔۔۔نیرا کے دماغ گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ پیروں تلے سے زمین نِکل گئی۔ دھاڑ دھاڑ دھڑام اور وہ محل جو مہینوں سے وہ اپنے دماغ میں بنارہا تھا آج دھڑام سے گِر پڑا۔ کیا یہ خواب تھا؟ نُورا اُسے سہارا دیے گھر لے جا رہی تھی۔ اس نے ایک دفعہ آنکھیں کھول کر اُس سے پُوچھا۔

"نُورا کیا یہ خواب تھا؟"

"تمہارا سر تھا۔" وہ ڈپٹ کر بولی اور وُہ چُپ ہو گیا۔

ایک ہفتے تک وہ کھویا کھویا سا رہا۔ رات کو سوتے میں اُچھل اُچھل پڑتا۔ نُورا نے بہت سے تعویذ اُس کے گلے میں لگا دیے تھے اور اُلٹی سیدھی دوائیاں بھی گھُونٹ گھُونٹ کر پلاتی رہتی۔ دو ہفتے بعد اُسے ہوش آیا اور کہنے سُننے کے قابل ہوا تو نُورا پاس جا بیٹھی اور بولی۔ "دیکھو، اب یہ اُلٹے سیدھے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ محنت کرو تو مُمکن ہے کُچھ دِنوں بعد مال دار بن جاؤ۔ یہ خیال چھوڑ دو کہ کہیں سے گِری پڑی دولت ہاتھ آ جائے گی یا کوئی پری تمہیں خزانہ بخش دے گی۔ ایسی باتیں صرف کہانیوں میں ہوتی ہیں اور یا خوابوں میں۔"

”افسوس میں نے کِتنی اچھی زمین کھو دی۔“ نِیرا آہ بھر کر بولا۔ ”اب صُبح کو زمیندار کے کھیت میں مزدوری کرنے جاؤں گا۔ زمین تو ہے نہیں جو اُسے جوتوں بوؤں۔“

”واہ زمین کیوں نہیں۔“ نُورا ہنس کر بولی۔ ”وہی خزانے والی زمین۔۔۔“

”ارے نُورا۔ وہ بنجر زمین۔ اس میں تو بیس برس سے ہل بھی نہیں چلا۔“ نِیرا بولا۔ ”اور پھر ہزاروں کنکر پتھّر جھاڑ جھنکار بھرے پڑے ہیں۔ اس میں تو ایک دانہ بھی نہ اُگے گا۔“

”بنائے سب کچھ بن جاتا ہے۔“ نُورا بولی۔ ”تم نے خزانے کی دُھن میں اُسے سارا کھود ڈالا ہے۔ کل صُبح ہم دونوں کنکر پتھّر اور جھاڑ جھنکار نِکال کر پھینک دیں گے اور پھر تُم ہل چلا کر بیج بو دینا۔“

”مگر بیج اور کھاد کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“ وہ افسردگی سے بولا۔

”دیکھو، میں ڈھونڈتی ہوں۔ شاید کہیں سے خزانہ مل جائے۔“ وہ ہنستی ہوئی اندر

گئی اور روپوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی اُس کے ہاتھ میں لا کر دے دی۔

"یہ میری پانچ سال کی جمع کی ہوئی پُونجی ہے۔ گھر کے خرچ سے پیسہ پیسہ بچا کر جمع کرتی رہی ہوں۔۔۔ اسے تُم جس طرح سمجھو کام میں لاؤ۔"

"نُورا تُو فرشتہ ہے۔ میں بُہت خراب آدمی ہوں۔" نِیرا کا سر شرم سے جھک گیا۔

دُوسرے دِن سے میاں بیوی نے زمین کی صفائی شروع کر دی۔ نِیرا کنکر، پتھّر اور جھاڑ جھنکاڑ ایک جگہ جمع کرتا جاتا اور نُورا انہیں باہر پھینک آتی۔

جب ساری زمین صاف ہو گئی تو اُسے ایک سا کر کے نِیرا نے اُس میں کھاد ڈالی، ہل چلایا اور بیج بکھیر کر بارش کا راستہ دیکھنے لگا۔

بارش ہوئی اور خوب دھوم دھڑاکے سے ہوئی۔ چند ہی دِنوں میں نِیرا کی محنت ننّھے مُنّے پودے بن کر کھیت میں لہلہانے لگی۔ نِیرا دیکھتا اور خوشی سے جھُوم جھُوم جاتا۔ گاؤں بھر میں سب سے اچھّی فصل نیرا کی ہوئی تھی۔

اور جب کھیت تیّار ہو گیا تو نِیرا اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کھیت پر لے گیا۔ کھیت کھڑا

جھُوم رہا تھا۔

"دیکھ نُورا۔ میرا خزانہ۔" وہ مُسکرا کر بولا۔

"دیکھ لیا۔" وہ مُسکرا کر بولی۔ "یہ سب میرا کیا کرایا ہے۔ میں تمہاری آنکھیں نہ کھولتی تو تُم پڑے خواب ہی دیکھا کرتے۔"

پودے بڑھے، بالیاں پکیں اور فصل کٹ گئی۔ نِیرا منڈی سے اناج بیچ کر آیا تو اُس کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی تھیلی تھی۔ افّوہ، اِتنے روپے تھے اُس میں کہ اُٹھائے نہ اُٹھتے تھے۔

چند ہی سالوں میں نِیرا کی دُنیا بدل گئی اور وہ جِن جِن چیزوں کے خواب دیکھا کرتا تھا آج سب اُس کے گھر میں موجود تھیں۔ اچھّے اچھّے کپڑے، اچھّا سا گھر اور گہنوں سے لدی ہُوئی نُورا۔ وہ اپنی محنت کو دیکھتا تو کِھل کِھلا اُٹھتا۔ اب ہر سال وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ فصل پار سال سے بھی اچھّی ہو اور مہنگے داموں منڈی میں بِکے۔

کبھی کبھی نُورا اُس سے پوچھ لیتی ہے۔ ”کہو سیٹھ جی کوئی خزانہ وزانہ ہاتھ آیا کہ نہیں؟ تو وہ جھینپ جاتا ہے اور دِکھاوے کے غُصّے سے کہتا ہے۔ ”جلدی کر مُجھے کھیت پر جانا ہے۔“

جل پری

کسی گاؤں میں شیدو نامی ایک افیمی مچھیرا رہتا تھا۔ افیمی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ افیم کھاتا تھا۔ اُس کی سستی، کاہلی اور ہر وقت سوچتے رہنے کی وجہ سے لوگ اسے افیمی کہا کرتے تھے۔ اٹھارہ انیس برس کے لگ بھگ عمر ہو گی۔ صُورت سے کافی ذہین معلوم ہوتا تھا۔ لوگ کہتے تھے اگر وہ کوئی کاروبار شروع کر دے تو کافی ترقّی کر جائے مگر اُسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ جب سے اُس کے ماں باپ اُسے چھوڑ کر اس دنیا سے سدھارے تھے وہ ہر وقت چُپ چاپ اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔

شیدو صبح سویرے ہی بنسیاں کاندھے پر رکھ کر دریا کے کنارے جا بیٹھتا اور شام کو جو کُچھ شکار ہاتھ آتا اسے لا کر بازار میں بیچ دیتا۔ یہی اُس کا روز مرّہ کا معمول تھا۔ وہ گاؤں میں بہت کم لوگوں کو جانتا تھا اور جن سے اُس کی جان پہچان تھی بھی تو بہت معمولی۔ لوگ اُسے خبطی سمجھا کرتے اور وہ لوگوں کو دیوانہ اور بے وقوف

خیال کرتا۔

ایک دن صُبح کے وقت وہ ندی کے کنارے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ”آہ کتنی خوب صُورت صُبح ہے بہار کا موسم بھی کتنا سُہانا اور من موہنا ہوتا ہے۔ لہلہاتے ہوئے پودے، جھومتے ہوئے سرسبز درخت، چہچہاتی ہوئی چڑیاں، ہر طرف بہار، ہر سو بہار! مگر مجھے کیا؟ میری قسمت میں تو تنہائی لکھی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی۔ میرا کوئی دوست نہیں جس سے باتیں کروں۔ کوئی غم خوار نہیں جس سے اپنے دل کا حال کہوں۔ کوئی بیوی نہیں۔ میں نے کیا کہا؟ بیوی؟ آہ! سچ کہا ہے بزرگوں نے کہ بغیر بیوی کے مرد کی مثال اس گاڑی کی ہے جس کا صرف ایک ہی پہیّا ہو۔۔۔۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اسے یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ وہ اٹھارہ سال سے کنوارا ہے اس نے اندر سبھا کی کہانی میں سُنا تھا کہ پرستان کی سبز پری ایک شہزادے کو اُٹھا کر پرستان لے گئی تھی اور اس سے شادی کر لی تھی۔ کاش اُسے بھی کوئی اُٹھا کر لے جاتا۔ پری نہ سہی کوئی دیونی ہی سہی۔ اب وُہ اس تنہائی سے

اُکتا گیا تھا مگر مچھیرے کی تقدیر میں تو صِرف مچھلیاں ہی لکھی ہوئی تھیں۔

اس نے پھر ایک گہری سانس لی اور پانی میں پڑی بنسی کو دیکھنے لگا۔ بنسی ہچکولے لینے لگی۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ کانٹے میں مچھلی پھنسنے والی ہے مگر وہ ویسے ہی داہنے ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ روزانہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ روز ہی بھولی بھالی مچھلیاں اُس کے کانٹے میں پھنستی تھیں۔ اس کے لئے یہ کوئی نئ بات نہ تھی۔ اُس نے اُکتا کر بنسی پر سے نگاہیں ہٹالیں اور اپنے داہنی جانب ٹیلے کے اُس پار نشیب میں نظر ڈالی تو آنکھیں وہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔

اس نے گھبرا کر آنکھوں کو زور سے ملا۔ پھر ملا اور نظر گڑو کے دیکھا۔ اُٹھتی ہوئی موجوں کے پاس ایک نہایت خُوب صورت لڑکی، جس کا اوپر کا دھڑ عورت جیسا تھا اور نِچلا مچھلیوں جیسا، ایک پتھّر پر بیٹھی اپنے سُنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ یہ جل پری تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت اور بھولا پن برس رہا تھا۔ وُہ اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر کسی خیال میں غرق کنگھی کرتی ہوئی کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔

شیدو مچھیرے نے ایسا دِل فریب نظّارہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ وُہ بچپن ہی سے کہانیوں میں سُنتا آیا تھا کہ اگر کوئی شخص جل پریوں کی جادُو کی ٹوپی حاصل کرلے تو پھر وُہ عمر بھر اُسی کے ساتھ رہتی ہیں کبھی اُسے چھوڑ کر نہیں جاتیں۔

وُہ دبے پاؤں جل پری کے پاس پُہنچا۔ جادُو کی ٹوپی اس کے پاس ایک پتھّر پر پڑی تھی۔ اس نے چُپکے سے اُٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ ٹوپی کا لینا تھا کہ ایسا معلُوم ہُوا جیسے کِسی نے جل پری کی جان نکال لی۔ وُہ بڑی بے قراری سے اُٹھی، کنگھی پھینک دی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اُسے روتا دیکھ کر شیدُو گھبرا کر بولا۔ "ارے، آپ رو کیوں رہی ہیں؟ خدا کے لیے رویئے مت۔" مگر لڑکی برابر سسک کر روتی رہی۔

شیدُو نے بڑی نرمی اور ملائمت سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ "آپ کون ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے؟"

جل پری خاموش ہو گئی اور ایک عجیب سی نظر سے شیدُو کو دیکھ کر بولی۔ "آدمی، کیا تم مُجھے کھا جاؤ گے؟"



شیدُو مچھیرا اُچھل پڑا اور تعجُّب سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "یہ تم سے کِس نے کہا کہ میں تمہیں کھا جاؤں گا؟ میں کوئی درندہ ہُوں؟"

جل پری کے چہرے پر مسرّت کی لہر دُوڑ گئی۔ آنکھیں جھپک کر بولی۔ "میری نانی امّاں کہتی تھیں کہ آدمی کی قوم ہماری دُشمن ہے۔ وُہ ہمیں پکڑ لیتا ہے تو بھُون کر کھا جاتا ہے مگر تم بہُت اچھّے آدمی معلُوم ہوتے ہو۔ تُم مُجھے نہیں کھاؤ گے۔ کیوں؟" "بالکل نہیں۔" شیدُو سر ہلا کر بولا۔ "بھلا سوچو تو تمہیں کیوں کھاؤں گا؟"

"اچھّا تو پھر میرا کیا کرو گے؟" جل پری نے بھولے پن سے پُوچھا۔

"آہ، میں کس طرح بتاؤں کہ میں تمہارا کیا کروں گا۔" شیدُو خُوشی سے ناچ کر بولا۔ "میں اٹھارہ سال سے اکیلا ہوں۔ بالکل اکیلا۔ میری زندگی بالکُل سُنسان اور اُجاڑ ہے۔ اس لمبی چوڑی دُنیا میں میرا کوئی ساتھی، کوئی دوست اور کوئی بیوی نہیں۔ بیوی آہ۔ میں تمہیں اپنی بیوی بناؤں گا۔ میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ کیا تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گی؟"

"آہاں۔" جل پری مُسکرا کر بولی۔ "مگر ذرا رُک جاؤ۔ میں بال ٹھیک کر لوں۔"
یہ کہہ کر اُس نے جلدی جلدی چوٹی باندھی، بال ٹھیک کیے اور کنگھی جیب میں رکھ کر پانی سے باہر نکل آئی۔

"تمہیں خُشکی پر چلنے میں تکلیف تو نہ ہو گی؟" شیدُو نے پُوچھا۔

"نہیں۔" وہ اِطمینان سے بولی۔ "اور پھر عادت پڑتے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا گھر کِتنی دُور ہے اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شیدا ہے۔" شیدُو نے جواب دیا۔ "مگر کم بخت گاؤں والے شیدُو شیدُو کہتے ہیں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام بہاراں ہے۔" لڑکی بولی۔ "سمندر کے باسی مُجھے موجوں کی شہزادی کہتے ہیں۔"

"موجوں کی شہزادی۔" شیدُو حیرانی سے بولا۔ "تو کیا تُم شہزادی ہو"

"ہاں۔" وہ فخر سے گردن اُونچی کر کے بولی۔ "میرا باپ سمندر کا بادشاہ ہے۔"

"میرے اللہ سچ مچ" شیدُو کو یقین نہ آتا تھا۔ "تو کیا میں ایک بادشاہ کی لڑکی سے شادی کروں گا؟" پھر وُہ پٹر پٹر آنکھیں مار کر بولا۔ "پھر تو تمہارا باپ سمندر کی تمام دولت کا مالک ہو گا۔ ہیرے جواہرات، موتی اور بہت سی دولت۔"

"دولت؟" وہ تعجّب سے بولی۔ "دولت کیا ہوتی ہے؟"

"ارے تم دولت نہیں جانتیں؟" شیدُو نے تعجُّب سے اچھّا۔ "دولت یعنی روپیہ پیسہ اور کیا؟ دولت سے تُم دنیا کی ہر چیز خرید سکتی ہو۔ مثلاً تمہارے پاس اگر دس پیسے ہوں تو تم پاؤ بھر گلاب گنڈیریاں خرید سکتی ہو۔ چار آنے ہوں تو ایک وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکتی ہو۔ خیر اسے چھوڑو۔ تُم نے کہا کہ تمہارا باپ بادشاہ ہے اور تم اُس کی بیٹی ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر تم مچھلیوں کو حکم دو کہ سمندر کی تہہ سے ہیرے جواہرات اور موتی نکال لاؤ تو کیا وہ تمہارا حکم مانیں گی۔"

"کیوں نہیں۔" وُہ بولی۔ "میں اُن کی شہزادی ہوں۔"

شیدُو خُوش ہو کر بولا۔ "تو پھر مُجھے یقین ہے کہ ہم بڑے آرام سے زندگی بسر کریں گے، کیوں کہ میں ایک غریب مچھیرا ہوں۔ ٹوٹے پھُوٹے جھونپڑے میں

رہتا ہوں۔ مجھے پلنگ اور بستر بھی میسّر نہیں ہیں۔ تمہارے لیے مسہری کہاں سے لاؤں گا؟"

"تُم اس کی فکر مت کرو۔" شہزادی ہنس کر بولی۔ "میرے پاس سمندر میں ہزاروں مسہریاں اور بستر ہیں۔ میں آج ہی مچھلیوں سے منگوالُوں گی۔" "اور ہیرے جواہرات بھی۔" شیدُو خُوشی سے اُچھل کر بولا۔ پھر ہم اِسی ندّی کے کنارے ایک شاندار کوٹھی بنوائیں گے۔"

وہ خُوش خُوش اُس کا ہاتھ پکڑے گھر لے آیا۔ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی کہ شیدُو افیمی ایک جل پری اپنے گھر لایا ہے۔ اس کے گھر کے دروازے پر میلا سا لگا رہنے لگا۔ بوڑھے، جوان، عورتیں، بچّے جوق در جوق اِس عجیب چیز کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔

دُوسرے دِن صُبح کو شیدُو جل پری کو لے کر مسجد کے مُلّا کے پاس پہنچا کہ وُہ ان دونوں کا نکاح پڑھا دے۔ مُلّا جی جل پری کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولے۔ "شیدُو، تُو اِس مچھلی سے شادی نہیں کر سکتا۔ ایسا دُنیا میں کبھی نہیں ہُوا کہ آدمی

نے مچھلی سے شادی کی ہو۔"

شیدُو سٹپٹا کر بولا۔ "حضور مولانا صاحب، یہ کوئی رہُو یا سِنگھاڑا مچھلی نہیں ہے۔ یہ جل پری ہے۔ میری قسمت کہ میرے ہاتھ لگ گئی۔ بھلا سوچیے تو سہی اِس سے شادی کر کے میں کیا سے کیا ہو جاؤں گا۔"

"میں پھر کہتا ہوں۔" مُلّا جی بولے۔ "کہ تُم اِس سے شادی نہیں کر سکتے، نہیں کر سکتے۔ یہ جانور ہے، تُم آدمی ہو۔"

شیدُو جھلّا کہ بولا۔ "آپ اسے جانور بتا رہے ہیں۔ ذرا اِس کے چہرے کی طرف تو دیکھیے۔ آہا۔ ہا۔ کتنا بھولا اور خوب صُورت چہرہ ہے۔ مانو چودھویں رات کے چاند کی حسین کِرنیں کسی صاف و شفاف دریا۔۔۔۔"

"بس، بس۔" مُلّا جی جھُنجھلا گئے۔ "مان لیا کہ بہُت خُوب صُورت ہے۔ مان لیا کہ یہ سُورج، چاند اور تمام ستاروں سے بھی زیادہ خوب صُورت ہے۔ مگر میں تُم سے کہتا ہوں کہ تم اس سے بیاہ نہیں کر سکتے۔ کیا سمجھے، تمہاری خیر اِسی میں ہے کہ اِسے واپس دریا میں چھوڑ آؤ۔"

"ایک بات اور صرف آخری بات میں آپ سے اور کہنا چاہتا ہوں۔" شیدُو کُچھ سوچ کر بولا۔ "آپ میری حالت سے اچھّی طرح واقف ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر میں نے اِس جل پری سے شادی کرلی تو میری زندگی بن جائے گی۔ سمندر کی تمام دولت میرے قبضے میں آ جائے گی۔ ہیرے، جواہرات، موتی۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ میرا نِکاح پڑھا دیجیے۔ میں آپ کو نہال کر دوں گا۔"

"خیر، یہ اور بات ہے۔" مُلّا جی بولے۔ "خُدا مُجھے معاف کرے۔ میں تمہارا نِکاح پڑھائے دیتا ہوں۔"

دونوں کی شادی ہو گئی۔ شیدُو راتوں رات مال دار ہو گیا۔ اس نے ایک نہایت شان دار مکان بنالِیا اور دونوں میاں بیوی آرام سے اُس میں رہنے لگے۔

تین سال گُزر گئے۔ اب شیدُو تین خُوب صُورت بچّوں کا باپ بن چُکا تھا۔ اس عرصے میں جل پری نے کبھی بھولے سے بھی اس سے اپنے ماں باپ کا ذِکر نہیں کیا تھا۔ وُہ اپنی پہلی دُنیا کو بالکُل بھُول چکی تھی۔ اُس نے کبھی اپنی ٹوپی کے بارے میں بھی نہیں پُوچھا تھا جِسے شیدُو نے ایک الماری کے پیچھے چھُپا دیا تھا۔

اِتّفاق کی بات اِنھی دِنوں شیدُو کو گاؤں سے باہر جانے کی ضرورت پیش آئی اور وہ کُچھ دِنوں کے لیے سفر پر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد جل پری نے سوچا کافی عرصے سے گھر کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ لاؤ جب تک وہ آئیں گھر کو ہی جھاڑ پُونچھ لُوں۔

اُس نے سارا سامان باہر نِکالا اور ایک ایک کونے اور ایک ایک دیوار کو جھاڑنا شروع کر دیا۔ جب جھاڑتی پُونچھتی اُس الماری کے پیچھے پُہنچی جس کے پیچھے ٹُوپی چُھپی رکھی تھی تو لپک کر ٹوپی کھینچ لی اور ایک دم اُس کی آنکھوں کے سامنے تین سال پہلے کی دنیا پِھر گئی۔ وہ موجیں مارتا دریا، ماں، باپ، بہن، بھائی، سہیلیاں۔ وہ سوچنے لگی خُدا جانے میرے ماں باپ کِس حالت میں ہوں گے۔ میری جُدائی اُنھوں نے کِس طرح برداشت کی ہو گی۔ میری سہیلیاں میرے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی؟ ایک بار صرف ایک بار اُن سے مِل آؤں اور پِھر کبھی نہیں جاؤں گی۔ مُشکل سے ایک دِن صرف ہو گا۔ شیدُو کو پتا بھی نہ چلے گا۔“

اُس نے بچّوں کو پیار کیا، سینے سے لگایا اور ٹوپی اوڑھ کر ایک دم دریا میں چھلانگ لگا

دی۔

آہ۔ پورے تین سال بعد وہ اپنی دنیا میں واپس آئی تھی۔ پانی کی لہر اِس سے گلے مِل مِل کر گِلے شکوے کر رہی تھیں کہ وہ کیوں اُنہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مچھلیاں اپنی پیاری شہزادی کے گِرد خُوشی سے ناچ رہی تھیں۔ اُسے معلُوم ہُوا۔۔۔ کہ وُہ وہی جل پری ہے، وہ کبھی زمین پر نہیں گئی اور اُس نے کِسی آدم زاد سے شادی نہیں کی۔ وہ پانی کی بیٹی ہے اور پانی ہی میں رہے گی۔ شیدُو اور ننّھے بچّے اُسے ایک خواب معلُوم ہو رہے تھے۔ بھُولا ہوا سا خواب۔ وہ بڑی آزادی اور بے فِکری سے تیَرتی ہوئی اپنے محل کی طرف جا رہی تھی۔

شیدُو گھر آیا۔ گھر تو تھا مگر گھر کی رانی نہ تھی۔۔۔ بڑا بچّہ توتلی زبان سے بولا۔ "ابّا، امّی پانی میں ڈوب گئی، بس۔" اور شیدُو دھم سے زمین پر گِر پڑا۔ گاؤں والے دیکھتے ہیں کہ شیدُو مچھیرا ندّی کے کنارے سر پکڑے گھنٹوں اُٹھتی ہُوئی موجوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے پاس ہی ریت میں تینوں بچّے کھیلتے رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب کبھی جل پری واپس نہیں آئے گی مگر

شیدُو نا اُمّید نہیں۔ اسے اُمیدؔ ہے کہ ایک نہ ایک دِن وُہ اپنے ننّھے مُنّے بچّوں کر دیکھنے ضرور آئے گی۔

پریوں کی پہاڑی

قصبہ کھڑک نگر کے قریب ایک خُوش نُما پہاڑی ہے جو پریوں کی پہاڑی کے نام سے مشہور ہے۔ لوگ اسے پریوں کی پہاڑی کیوں کہتے ہیں؟ یہ اِس کہانی سے معلُوم ہو گا جو قصبے کے بچّے بچّے کو ازبَر یاد ہے اور وہ قصبے میں آنے والے مسافروں کو مزے لے لے کر سُناتے ہیں۔

قصبے کے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ آج سے دو سو سال پہلے پہاڑی بڑی سر سبز اور شاداب تھی۔ اس میں جا بجا خُوش نُما آبشاریں اور جھرنے بہتے تھے۔ پہاڑی کی سب سے اُونچی چوٹی پر گھاس کا ایک وسیع میدان تھا۔ قصبے کے گڈریے اسی میدان میں اپنے ریوڑ چرایا کرتے اور رات گئے تک نِکھری ہوئی چاندنی میں چمکتے دمکتے چندما اور آنکھ مچولی کرتے تاروں کی گھنیری چھاؤں میں بیٹھے گپیں ہانکتے، کہانیاں کہتے اور جب کافی رات ہو جاتی تو اپنے اپنے ریوڑ ہانک کر نیچے اُتر آتے۔

یہ چھوٹی سی پہاڑی قصبے والوں کے لیے ایک آسمانی تحفہ تھی۔ گرمیوں میں

چلچلاتی دھوپ اور جھلسا دینے والی لُو سے گھبرا کر وہ پہاڑی پر چڑھ جاتے۔ وہیں برسات کے دِنوں میں ساونیاں ہوتیں۔ پکوان پکتے، جھُولے ڈالے جاتے اور قصبے کی لڑکیاں رنگ برنگی چُنریاں اوڑھ کر، ہاتھوں میں مہندی رچا کر، برستے بادلوں کو خوشی و مسرّت کا سندیس سُناتیں۔

پھر ایک دم ایسا ہوا کہ جیسے کسی نے اس خُوب صُورت اور شاداب پہاڑی کی ساری بہاریں لُوٹ لی ہوں۔

کہتے ہیں کہ برسات کی ایک رات کو پریوں کی ملکہ نکہت اس پہاڑی پر سے گُزری اور اسے یہاں کی سرسبز گھاس، کِھل کھلاتے جھرنے، گُنگناتے آبشار اور جھُومتے ہوئے درخت ایسے بھائے کہ وہ یہیں کی ہو رہی اور پرستان کی حسین و جمیل دُنیا کو ایسا فراموش کیا کہ وہاں جانے کا نام نہ لیا۔ اب پہاڑی پر رات کو جگمگاتے آسمان کے نیچے ملکہ نکہت کا دربار لگا کرتا، ناچ رنگ کی محفل جمتی اور ساری پہاڑی پریوں کے قہقہوں سے گونج اُٹھتی۔

قصبے والوں پر خوف طاری تھا۔ گڈریوں نے مارے ڈر کے پہاڑی پر چڑھنا چھوڑ

دیا تھا۔ جانور مزید ار گھاس کو ترس گئے تھے۔ گاؤں والوں میں اِتنی طاقت نہ تھی کہ وہ پریوں کی ملکہ سے پہاڑی چھِین سکیں۔ اگر کوئی شخص بھولے سے اُس کے خلاف کُچھ کہہ بھی دیتا تو سُننے والے فوراً ہی اُس کا مُنہ بند کر دیتے کہ کہیں ملکہ خفا ہو کر قصبے پر کوئی آفت نازل نہ کر دے۔

پریوں کے قصّے سارے قصبے میں مشہور ہو چُکے تھے۔ شام کے وقت بڑے بڑے بہادر پہاڑی کے پاس جاتے ہُوئے خوف کھاتے تھے۔ ننّھے ننّھے بچّے رات کو خواب میں اُنہیں دیکھتے اور خوف کے مارے اپنی ماؤں کی گود میں چھُپ جاتے۔

قصبے میں ایک نٹ کھٹ جوان رہا کرتا تھا۔ نام تھا بہادُر دیکھنے یُونہی سا لگتا مگر ہاتھ پیر کا بُہت مضبُوط تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہاڑی کے مُتعلّق قصبے والوں میں خواہ مخواہ کی باتیں مشہُور ہو گئی ہیں اور وہ اپنی جہالت کی وجہ سے پریوں کے جھُوٹے سچّے قصّوں سے خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ ورنہ اصل میں دیو پری اور جن بھُوت کا دُنیا میں کوئی وجود نہیں۔ یہ سب جاہلوں اور ڈرپوکوں کا وہم ہے۔

بہادُر قصبے بھر میں پریوں کو بڑی بے باکی سے بُرا بھلا کہتا پھرتا اور جب لوگ

اُسے روکتے تو وُہ قہقہہ لگا کر کہتا۔ ”بس ڈر گئے؟ تُم وہی تو ہو جو کہتے تھے کہ میں نے دو شیر مارے اور چار گینڈے پکڑے۔ خیالی باتوں سے خوف کھاتے ہو۔ بھیّا کہیں پریاں بھی کوئی چیز ہوتی ہیں؟۔۔۔ نہیں؟۔۔۔ تو پھر کیوں خواہ مخواہ ڈر کے مارے مرے جاتے ہو؟“

قصبے کے بڑے زمیندار نے بہادُر کی یہ باتیں سُنیں تو اُن کے کان کھڑے ہوئے۔ اُسی زمیندار کے پاس قصبے بھر میں سب سے زیادہ جانور تھے جو اچھّی گھاس نہ ملنے کی وجہ سے دن بدن دُبلے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک دِن اُس نے بہادُر کو اپنے گھر بُلایا اور بولا۔ ”میں نے سُنا ہے کہ تُم پریوں کے قصّے پر یقین نہیں کرتے؟“

”بالکل نہیں۔“ بہادُر اکڑ کر بولا۔ ”یہ سب جہالت اور نادانی کی باتیں ہیں۔“

”شاباش!“ زمیندار بولا۔ ”میں بھی لوگوں کی باتوں کا یقین نہیں کرتا۔ اچھّا اگر تُم اپنی بات کے سچّے ہو تو کل سے میرے ریوڑ پہاڑی پر چرانے لے جایا کرو۔ میں تمہیں دُگنی تنخواہ دوں گا۔ بولو منظور ہے؟“

بہادُر کو گڈریا بننا پسند نہ تھا مگر اُس نے سوچا کہ میں نے منع کر دیا تو سارے گاؤں میں میری بہادُری کی پول کھُل جائے گی اور لوگ مُجھے گیّا سمجھیں گے۔ بولا۔ ”اچھّی بات ہے آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کے جانوروں کو کل سے پہاڑی پر چرایا کروں گا۔“

زمیندار خوش ہو گیا۔ لوگوں نے سُنا تو دانتوں میں اُنگلیاں دے لیں۔ بڑے بُوڑھوں نے سمجھایا مگر بہادُر کھڑا ہنستا رہا۔ ”ہاہاہا۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”ارے بھائی مروں گا تو میں مرُوں گا۔ تُم خواہ مخواہ سہمے جاتے ہو۔“

”جان بُوجھ کر موت کے مُنہ میں جانا بہادُری نہیں۔“

قصبے کے ایک بزرگ نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اُسے سمجھایا۔ ”بلکہ بے وقوفی اور حماقت ہے۔“

”اور ایک جھُوٹ مُوٹ کی چیز سے خوف کھانا عقل مندی ہے؟“ بہادُر نے پُوچھا۔

"تُم اپنی جوانی اور طاقت کے غرور میں بھُوت پریوں کو وہم سمجھتے ہو۔ لیکن ابھی بچّے ہو۔ میری رائے میں تو اِس خیال سے باز آؤ۔ ورنہ قصبے کو تُم جیسے بہادُر اور کڑیل جوان سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔ بہادُر کے دوست چمن نے اُسے سمجھایا۔

"لیکن میں زمیندار سے وعدہ کر چکا ہوں۔" بہادُر بولا۔ "میں کل صُبح پہاڑی پر ریوڑ ضرور چراؤں گا۔"

قصبے میں کھلبلی مچ گئی۔ بڑے بُوڑھے حیران تھے، جوان خُوف زدہ اور بچّے ایک مزے دار کہانی سُننے کے لیے بے تاب۔

دُوسرے دِن صُبح کو بہادُر زمیندار کا ریوڑ لے کر پہاڑی پر جانے لگا تو اُس کے دوستوں اور مِلنے جُلنے والوں نے بڑی حسرت سے اُس سے ہاتھ مِلائے۔ اُن کا خیال تھا کہ بہادُر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ اب کبھی واپس نہ آئے گا۔ اور ہنس ہنس کر سب سے رُخصت ہُوا اور ریوڑ کو ہانکتا ہوا پہاڑی پر چڑھ گیا۔

سارا دِن اُس کے جانور اِدھر اُدھر گھاس چرتے رہے۔ مُدّت بعد اُنہیں ایک دفعہ

پھر جنّت میں آنے کا موقع ملا تھا۔ خُوب کلیلیں کر رہے تھے اور نرم نرم گھاس مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

شام ہوئی، سُورج ڈوبنے لگا۔ بہادُر اِطمینان سے پتھّر پر بیٹھا جھرنے کی پھُوار سے کھیل رہا تھا۔

"ارے بھئی پریو، کہاں ہو تُم۔" وہ زور زور سے ہنس کر بولا۔ "ایں۔ یہ کیا؟ اُس نے گھبرا کر کان کھڑے کیے۔ کچھ فاصلے پر دو ننّھے ننّھے قہقہے گُونجے اور ہوا میں گھُل مِل گئے۔ پھر اُسے ایسا معلُوم ہُوا کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ یہ آدمی اپنے آپ کو بہُت بہادُر سمجھتا ہے۔ معلُوم ہوتا ہے اِس کی قضا آئی ہے۔ آؤ چلو ملکہ نکہت کو خبر کریں۔ وہی اِس کی مزاج پُرسی کرے گی۔"

بہادُر یہ سُن کر گھبرا گیا۔ اُس کے دِل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی ڈر اُس پر غالب آجاتا اور کبھی وہ ڈر پر۔ چاند اُونچا ہو چُکا تھا اور ساری پہاڑی پر نُور برس رہا تھا۔ وہ چوکنّا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں اُسے ایک بڑا سا سایہ اپنی طرف بڑھتا ہُوا دِکھائی دیا۔ یہ ایک خوفناک کالی بِلّی تھی جو

لمبے لمبے نوکیلے پنجے نِکالے اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر کون ایسا بہادُر ہو گا جو مارے خوف کے بے ہوش نہ ہو جائے گا مگر بہادُر نے سوچا، یہی وقت ہمّت اور جرأت کا ہے۔ اگر اِس وقت میں ڈر گیا تو پھر مُجھے جیتے جی قصبے میں لوٹنا نصیب نہ ہو گا۔ اُس نے لاٹھی اُٹھا کر دونوں ہاتھوں میں مضبُوطی سے تھام لی کہ اگر بِلّی اُس پر حملہ کرے تو وہ ایک ہی وار میں اُس کا سر پھوڑ دے۔ پھر زبردستی کا ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ملکہ عالیہ، ابھی ابھی میں آپ کی چند سہیلیوں کے مُنہ سے آپ کی تعریف سُن چُکا ہُوں۔ آپ کا یہ سوانگ بھرنا بے سُود ہے۔ سیدھی طرح میرے سامنے اپنی اصلی صُورت میں آ جایئے ورنہ مُجھے پھر آپ کی شان میں گُستاخی کرنی پڑے گی۔“

ملکہ اُس کی دیدہ دلیری سے دنگ رہ گئی۔ وہ فوراً بِلّی سے ایک مرکھنا بچھڑا بن گئی اور سینگ اُٹھا کر چاہتی تھی کہ بہادُر کا پیٹ پھاڑ ڈالے کہ وہ قلانچے مار کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے سینگ پکڑ کر بولا۔ ”اچھّا تو میاں بچھڑے۔ اب تُم ذرا مُجھے اپنی چال دِکھاؤ۔“



اور پھِر اُس کے بعد اس بچھڑے نے جو چوکڑیاں بھرنی شروع کی ہیں تو نہ معلُوم کتنے جنگل، کتنے دریا اور کتنے پہاڑ پھلانگ گیا مگر بہادُر بدستور اُس کے سینگ پکڑے پیٹھ پر جما بیٹھا رہا۔ آخر ملکہ نے جھنجلا کر اُسے ایک میدان میں ٹپک دیا۔ وہ بڑے اِطمینان سے پیٹھ سہلا کر بولا۔ ”تُم عجب بچھڑے ہو۔ پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑتے ہو۔ ہاہاہاہا۔“ ایک دم ملکہ نکہت اپنی اصلی صورت میں آگئی اور بہادر کی پیٹھ ٹھونک کر بولی۔ ”بہادُر لڑکے، واقعی تُم بہادُر ہو۔ میں تُم جیسے دِلاور اور دلیر لڑکے کو مارنا نہیں چاہتی۔ تمہاری ہمّت اور جرأت نے میرے دِل پر بُہت اثر کیا ہے۔ اب بتاؤ کیا تُم اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہو؟“

”جانا تو چاہتا ہُوں۔“ بہادُر مُسکرا کر بولا۔ ”مگر جیسا کہ آپ جانتی ہیں مُجھے نہیں معلُوم کہ میں اِس وقت کہاں ہوں اِس لیے۔۔۔۔“

”میرا ہاتھ پکڑ لو۔۔۔“ ملکہ بولی۔ ”میں تمہیں ابھی پہاڑی پر پُہنچانے دیتی ہُوں۔“

دِن نِکل چکا تھا اور اب دُنیا پر چاند کے بجائے سُورج کی حکومت تھی۔ پہاڑی پر

بہادُر کے جانور اِدھر اُدھر گھاس چرتے پھر رہے تھے۔ ملکہ اُسے زمین پر اُتار کر بولی۔ ”بہادُر لڑکے، اب تُم گھر جاؤ۔ میں تمھیں اِجازت دیتی ہوں کہ تُم اپنے جانور پہاڑی پر چرا سکتے ہو۔ میرا کوئی آدمی تمھیں نقصان نہیں پُہنچائے گا۔ میں اس برسات تک یہاں اور رہُوں گی۔ اِس کے بعد یہ پہاڑی پہلے کی طرح قصبے والوں کی ہو جائے گی۔ مگر یاد رکھو جب تک میں یہاں رہوں تمہارے سوا یہاں اور کوئی نہیں آ سکتا۔“

بہادُر نے ملکہ کا شکریہ ادا کیا اور ریوڑ ہانک کر پہاڑی سے اُتر گیا۔ قصبے والے اُس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ دوستوں کے چہروں پر حسرت ٹپک رہی تھی اور بڑے بُوڑھے سر ہلا ہلا کر نوجوانوں سے کہہ رہے تھے۔ ”دیکھا، جو شخص بزرگوں کا کہا نہیں مانتا اُس کا یہی حشر ہوتا ہے لیکن جب انہوں نے بہادُر کو صحیح سلامت آنے دیکھا تو وہ حیرت کے مارے چیخ اُٹھے۔

بہادُر نے اُنہیں سارا قِصّہ سُنایا اور جب اُس نے یہ کہا کہ پریوں کی ملکہ نے اُسے پہاڑی پر جانور چرانے کی اجازت دے دی ہے تو لوگوں کی باچھیں کھِل گئیں اور

تمام لوگ اُس کی خوشامد کرنے لگے کہ وُہ اُن کے جانور چرایا کرے، وُہ اُسے مُنہ مانگی تنخواہ دیں گے۔

برسات گُزر گئی تو پریوں کی ملکہ پہاڑی چھوڑ کر پرستان چلی گئی۔ جاتے وقت اُس نے بہادُر کو بہت سی دولت دی۔ بہادُر کہتا تھا کہ ملکہ نکہت نے اُسے پرستان دِکھانے کا بھی وعدہ کیا تھا مگر یا تو وہ گھر جا کر بھُول گئی یا اِس دُنیا ہی سے کُوچ کر گئی۔ کیونکہ بُہت دِنوں تک وہ اُس کی راہ دیکھتا رہا لیکن وہ نہ آئی۔ آخر اُس نے پرستان دیکھنے کا خیال ترک کر دیا اور شادی کر کے آرام سے زندگی گزارنے لگا۔

گدڑی کالال

''بہت دِن ہوئے۔ سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس میں ایک بیوہ رہا کرتی تھی۔ اُس کا ایک ننّھا سا بچّہ تھا۔ وہ روزانہ سمندر کے کنارے چلی جاتی اور مچھیروں کی گِری پڑی مچھلیاں جمع کر کے لے آتی۔ اس طرح اس کا اور اس کے بچّے کا گُزارہ چل رہا تھا۔

ایک دِن وہ سمندر کے کنارے مچھلیاں چُن رہی تھی کہ کچھ دُور ایک جہاز آ کر ٹھہرا اور اُس میں سے تین آدمی ایک کشتی پر سوار ہو کر ساحِل پر آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں دُور بینیں تھیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے عورت کی طرف آ رہے تھے۔ غریب عورت نے ڈر کے مارے مچھلیوں کی ٹوکری زمین پر رکھ دی اور بیٹے کو سینے سے چمٹا کر خوف بھری نظروں سے آنے والوں کو دیکھنے لگی۔ ایک موٹا سا بُوڑھا آدمی جو شکل صُورت سے جہاز کا کپتان معلوم ہوتا تھا، دُور بین سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''ہم سے کتنی بھاری غلطی ہوئی کُہر اور دُھند کی وجہ سے

غلط جگہ اُتر پڑے۔ یہ وہ جزیرہ نہیں۔ خیر، آؤ اس عورت سے پُوچھیں۔"

وہ عورت کے پاس آیا اور نرمی سے بولا۔ "بہن، کیا تُم یہیں کہیں رہتی ہو؟"

"جی؟ جی ہاں۔" عورت جھجک کر بولی۔ "میں پاس ہی کے گاؤں میں رہتی ہوں۔۔۔" یہ کہہ کر وہ جانے کو مُڑی۔

کپتان اُسے روک کر بولا۔ "کیا یہاں قریب کوئی شہر ہے؟ ہمیں کُچھ خریدنا ہے۔"

"یہاں قریب میں کوئی شہر نہیں۔" عورت نے جواب دیا۔

وُہ تینوں واپس جانے کے لیے نِکلے ہی تھے کہ کپتان کی نظر عورت کی گود میں دُبکے ہوئے بچّے پر پڑی۔ وہ اُسے غور سے دیکھ کر بولا۔ "آہ! کتنا پیارا بچّہ ہے۔ دیکھنا۔ دیکھنا۔ اس کے چہرے سے معلُوم ہوتا ہے کہ یہ جوان ہو کر بڑا بہادُر اور ہوشیار ملّاح بنے گا۔ اے عورت! کیا یہ تیرا بچّہ ہے؟ اس کا باپ کہاں ہے؟"

عورت کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ گئیں۔ وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔ "اس کا۔۔۔ باپ۔۔۔ اس کے۔۔۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ اب

میں۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ زور زور سے سِسکیاں بھرنے لگی۔

بُوڑھے کپتان نے اِس طرح سر ہلایا جیسے اُس کے دِ ِل پر بہت اثر ہوا ہے۔ وہ بچّے کو دوبارہ غور سے دیکھ کر بولا۔ "غریب عورت، یہ بچّہ اگر تیرے پاس رہا تو مُجھے ڈر ہے کہ یہ وُہ نہ بن سکے گا جو اسے بننا چاہیے۔ اس لئے اگر تو اپنے بچّے سے سچّی محبّت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ یہ بڑا ہو کر دنیا میں نام پائے تو اُسے مُجھے دے دے۔ میں اسے اپنے بچّے کی طرح پالوں گا۔ اِس کے بدلے تُو مُجھ سے جِتنی دولت چاہے لے سکتی ہے۔"

ماں نے اپنے اکلوتے بچّے کی طرف محبّت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر اسے سینے سے لگا کر بولی۔ نہیں۔ نہیں۔ میں اپنے بچّے کو کِسی قیمت پر بھی نہیں دے سکتی۔ دُنیا میں صرف یہی ایک میری زندگی کا سہارا ہے۔ مُجھے مرنا منظور ہے مگر اِسے جُدا کرنا منظور نہیں۔"

"یہ تمہاری غلطی ہے۔" کپتان بولا۔ "ذرا سوچو۔۔۔ تمہارے پاس یہ رہا تو بڑا ہو کر زیادہ سے زیادہ مچھیرا بنے گا۔ مگر میں اِسے آدمی بنا دُوں گا۔ ایسا آدمی جس پر

تُم فخر کر سکو۔"



عورت کی آواز بھرّا گئی۔ ایک طرف بچّے کی مامتا، دُوسری طرف اُس کی راحت اور آرام۔ اُس نے سوچا بُوڑھا کپتان سچ کہتا ہے۔ اُس کی صُورت سے معلُوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا مہربان اور خُدا ترس اِنسان ہے۔ اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے بچّے کو اُس کی گود میں دے دیا اور کپتان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی ایک گڈّی اُس کے ہات میں دے دی۔

"یہ لو۔۔۔" وہ روپے دے کر بولا۔ "یہ تمہارے دس سال کا خرچ ہے۔ دس سال بعد میں تمہارے بچّے کو لے کر آؤں گا۔ تُم کِسی قسم کی فکر نہ کرنا۔ خُدا حافظ۔" یہ کہہ کر وُہ جس تیزی سے آیا تھا، اُسی تیزی سے واپس مُڑ گیا۔

ماں بُہت دیر تک کنارے پر کھڑی حسرت بھری نظروں سے جاتے ہُوئے جہاز کو دیکھتی رہی اور جب وُہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو آہستہ آہستہ چلتی گھر واپس آ گئی۔

اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر گئے۔ بیوہ کا ننّھا بچّہ، بچّے سے لڑکا اور لڑکے سے ایک نوجوان بن گیا۔ بوڑھے کپتان نے اُس کا نام رشید رکھا۔ یہ اُٹھارہ سال رشید نے

جہاز ہی پر گزارے تھے۔ زین پر اُترنا اُسے بہُت کم نصیب ہوتا۔ اس نے جہاز ہی پر ہوش سنبھالا اور جہاز پر وُہ دو سال کے کمزور بچّے سے بیس سالہ خُوب صُورت اور تنومند جوان بنا۔ کُچھ تو خود اُس کی دِلچسپی اور ذہانت اور کُچھ بوڑھے کپتان کی تعلیم، وُہ کم سنی ہی میں ملّاحی کے تمام گُر گھاٹ سے اچھّی طرح واقف ہو گیا اور اُس نے بحری سفر کے سارے قاعدے قانون ذہن نشین کر لیے۔ بُوڑھا کپتان اُس کی عقل مندی اور بہادُری کو دیکھتا اور دِل ہی دِل وہ میں مُسکراتا۔ اب وہ خود تو کسی کونے میں بیٹھ کر تمباکو پیتا اور نوجوان رشید جہاز کی دیکھ بھال کیا کرتا۔

کبھی کبھی رشید کو اپنی ماں یاد آجاتی۔ وُہ پوچھتا ''ابّا، کیا میری کوئی ماں نہیں تھی؟''

''یہ مت پُوچھو بیٹا۔'' کپتان جواب دیتا۔ ''تمہاری ماں تھی اور بہُت نیک اور شریف عورت تھی۔ تُم دو سال کے تھے کہ وُہ تمہیں چھوڑ کر اِس دُنیا سے سُدھار گئی۔ پھر اتنی آہستہ کہ رشید نہ سن سکے، بڑبڑا کر کہتا۔ خُدا معلُوم کس حال میں ہو گی بے چاری۔ چار سال سے کوشش کر رہا ہوں کہ مل لاؤں مگر کوئی نہ کوئی رُکاوٹ آ کھڑی ہوتی ہے۔ خیر۔۔۔''

"جس جہاز پر رشید کام کرتا تھا وُہ بہُت بڑے تاجر کا جہاز تھا۔ اُس کے پاس اِس جہاز کے علاوہ چھ جہاز اور تھے جِن کے ذریعہ وہ دُنیا بھر میں تجارت کرتا اور خوب نفع کماتا۔

اب کے رشید کا جہاز تجارت کا سامان بیچ کر واپس آیا تو تاجر نے بُوڑھے کپتان کو اپنے پاس بُلایا اور بولا۔ "میرے دوست، میری عُمر اِس وقت اسّی سال کی ہے۔ میں نے اب تک کروڑوں روپیہ کمایا اور خُدا کا شکر ہے کہ مُجھے دُنیا کی کِسی چیز کی حسرت نہیں۔ بس ایک آرزو ایسی ہے جو مرتے وقت میں دِل میں لے جاؤں گا اور وہ ہے اولاد۔ خیر میری تقدیر۔ اب میں چونکہ بہُت بُوڑھا ہو گیا ہوں اِس لیے چاہتا ہوں کہ اپنے مال و دولت کا کِسی نیک اور شریف آدمی کو وارث بنا دُوں۔ تم میرے بچپن کے دوست ہو اور جتنی خدمت تُم نے میری کی ہے کسی نے نہیں کی۔ اس لیے میری نظر میں تُم ہی میری دولت کے مستحق ہو۔ اگرچہ تم بھی کافی بُوڑھے ہو اور میری طرح تمہارے بھی کوئی اولاد نہیں ہے۔"

کپتان جلدی سے بولا۔ "جناب، شاید آپ کو خبر نہیں کہ میرا ایک لڑکا ہے،

اٹھّارہ سال کا گبرُو جوان۔ میں نے اُسے ملّاحی کے تمام گُر بتا کر ایک ہوشیار کپتان بنا دیا ہے اور وہ بڑے بڑے جہاندیدہ کپتانوں کے کان کُترنے لگا ہے۔ بڑا لائق اور ہونہار لڑکا ہے۔"

"اچھّا۔۔۔" تاجر تعجّب سے بولا۔ "مگر تُم نے ہمیں کبھی نہ بیایا کہ تمہاری کوئی اولاد ہے۔"

"میرے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے میں آپ کو بتاتا۔" کپتان نے جواب دیا۔ "میرے نجی معاملات سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی۔ ضرُور ہو سکتی ہے۔" بُوڑھا سوداگر بولا۔ "تُم فوراً اپنے لڑکے کو میرے پاس لے کر آؤ۔"

کپتان خُوش خُوش دوڑا ہُوا جہاز پر گیا اور رشید کو اپنے ہمراہ لے کر آ گیا۔ بوڑھے سوداگر نے اُسے تعریفی نظروں سے دیکھا اور مُسکرا کر بولا۔ "خُوب خُوب! نوجوان تُم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟ میں اپنی تمام دولت اور جائداد تمہارے نام کر دوں گا۔ تم میرے بیٹے کہلاؤ گے۔"

رشید تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا ”جناب میں بچپن ہی سے سمندر میں رہا ہوں۔ سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھا کر ہی میں نے ہوش سنبھالا اور سمندر کے خوفناک پانیوں میں ہی میں پل بڑھ کر جوان ہُوا۔ اس لیے مجھے سمندر سے محبّت ہے مگر چُونکہ آپ کی مرضی مُجھے اپنے ساتھ رکھنے کی ہے اس لیے مُجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں خوشی سے آپ کی خدمت کروں گا۔“

اُس دِن سے رشید بڑے تاجر کے پاس رہنے لگا اور مال گوداموں کا مینجر بنا دیا گیا۔ اُس نے تھوڑے ہی دِنوں میں اپنی محنت اور لیاقت سے اِتنا اچھّا اِنتظام کیا کہ بِکری بڑھنے لگی اور اِتنے تاجر مال خریدنے آنے لگے کہ سب کی مانگ پوری کرنی دشوار ہو گئی۔“

سارے گودام خالی پڑے تھے اور جہاز ابھی مال لے کر نہیں آئے تھے۔ یہ دیکھ کر رشید نے سوداگر سے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں دو تین جہاز لے کر خُود جاؤں اور جتنی جلد ہو سکے مال لے آؤں۔ اگر تھوڑے دنوں اور مال نہ آیا تو تجارت کو سخت نُقصان پُہنچے گا۔“

بُوڑھا دِل سے تو نہ چاہتا تھا کہ رشید اُسے چھوڑ کر جائے مگر اُس کی ضِد دیکھ کر بے دِلی سے اِجازت دے دی اور رشید جہاز لے کر روانہ ہو گیا۔

تِینوں جہاز سمندر کی خوفناک موجوں کو چیرتے پھاڑتے منزل مقصود کی طرف چلے جا رہے تھے کہ یکایک طوفان آ گیا۔ طوفان اِتنا سخت اور خوفناک تھا کہ سمندر کی لہریں تیس تیس چالیس چالیس فُٹ تک اُٹھنے لگیں اور جہاز کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈولنے لگے۔

بہادُر رشید نے اپنے حواس بجا رکھے۔ وہ اس سے پہلے سیکڑوں طوفان دیکھ چُکا تھا مگر اُس وقت وُہ ایک ہی جہاز کی نگرانی کرتا تھا اور اب تین جہاز اُس کی کمان میں تھے۔ کبھی وُہ ایک جہاز کو اشارے سے ہدایت دیتا اور کبھی دوسرے کو۔ طُوفان لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا اور پانی کی دُھند ہر طرف چھا رہی تھی۔ اس افراتفری میں تینوں جہاز ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور جِدھر کو موجیں لے گئیں، بہتے چلے گئے۔

رشید کا جہاز مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے آخری بار بچھڑے ہُوئے جہازوں

کو دُور بین سے دیکھنے کی کوشش کی مگر سمندر کی بے پناہ موجوں کے سوا اُسے کُچھ نظر نہ آیا۔

رات بھر اس کا جہاز موجوں کے رحم و کرم پر چلتا رہا۔ صُبح کو جب طُوفان تھما تو ایک جزیرہ نظر آیا۔ اس نے ملّاحوں کو وہاں لنگر ڈالنے کا حکم دیا تا کہ معلُوم ہو سکے کہ وُہ کہاں ہیں اور اُن کی منزلِ مقصود یہاں سے کتنی دور ہے۔

جہاز کنارے سے کُچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا اور رشید کشتی کے ذریعے دو تین تجربہ کار ملّاحوں کو لے کر کنارے پر اُترا۔ اس نے دیکھا کہ دو آدمی ایک مُردے کو بُری طرح پیٹ رہے ہیں۔ ایک شخص اُس کے سر پر جوتے مار رہا تھا اور دوسرا اُس کی داڑھی اور مُنہ نوچ رہا تھا۔

رشید کو یہ دیکھ کر بُہت دُکھ ہوا۔ وُہ جلدی سے اُن لوگوں کے قریب پہنچا اور ڈانٹ کر بولا۔ ''اِس لاش کی کیوں بے حُرمتی کر رہے ہو؟ تمہیں خُدا کا خُوف نہیں؟'' ایک آدمی آنکھیں نِکال کر بولا۔ ''تم دخل دینے والے کون؟ یہ ہمارا قرض خوار ہے۔ پانچ سال ہوئے اِس نے ہم سے پچاس روپے قرض لیے تھے

اور قرضہ چُکائے بغیر مر گیا۔ اب ہم اِس کی لاش کو مار کر اپنا دِل ٹھنڈا کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے پھر اُسے دُھنا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو۔" رشید انہیں رُوک کر بولا۔ "یہ لو پچاس روپے اور اِسے چھوڑ دو۔" اُس نے جیب سے پچاس روپے نِکال کر اُن کے آگے پھینک دیے اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک گڑھا کھود کر لاش کو دفن کر دیا۔

"یہ عجیب مُلک ہے۔" وُہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "کیا تُم اِس سے پہلے بھی یہاں آئے ہو؟"

"میں تو کبھی نہیں آیا۔" ایک ملّاح بولا۔ "سُنا ہے کہ مشرق کی طرف ایک جزیرہ ہے جِس کا نام زنگار ہے۔ کہیں یہ وُہی تو نہیں؟"

"ہو گا۔" رشید بے پروائی سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔ کُچھ دُور چلنے کے بعد وہ ایک بستی میں پہنچے جہاں ایک میدان میں بُہت سے لوگ جمع تھے اور اُن کے بیچ میں ایک بُہت بڑا الاؤ جل رہا تھا۔ الاؤ کے پاس ایک خُوب صُورت لڑکی رسّیوں سے بندھی پڑی تھا جیسے یہ لوگ اُسے آگ میں جلانے کی تیّاریاں کر رہے ہیں۔ رشید

بھیڑ کو چیرتا ہُوا آگ کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ اِس لڑکی کو کیوں آگ میں جھونک رہے ہو؟“

ایک بُوڑھا آدمی جو اُن لوگوں کا سردار معلُوم ہوتا تھا، آگے بڑھا اور گرج کر بولا۔ ”تم پُوچھنے والے کون ہو۔ ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ اِس عورت کو زندہ جلا دیا جائے۔“

رشد نرمی سے بولا۔ ”تمہارا بادشاہ کیوں اِس بے کَس لڑکی کو آگ میں جلانا چاہتا ہے؟“

ایک اور آدمی جو صورت سے بھلا مانس دِکھائی دیتا تھا، بولا۔ ”اس لڑکی نے ہمارے بادشاہ سے وعدہ کیا تھا کہ وُہ ایک مہینے بعد اُس سے شادی کر لے گی مگر یہ اپنے وعدے سے پھر گئی اور شادی سے اِنکار کر دیا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر حکم دے دیا کہ اِسے اور اِس کے سارے خاندان کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ اس کے ساتھی تو کل جلا دیے گئے اور آج اِس کی باری ہے۔ مگر تمہیں کیا؟ تُم اپنا راستہ لو۔“

”ٹھہرو۔“ رشید بولا۔ ”اور اُس نے اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی نکال کر اُس آدمی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ”اِس میں اِتنی اشرفیاں ہیں کہ تم عُمر بھر مزے سے کھا سکتے ہو۔ یہ اشرفیاں لے لو اور اِس مظلوم عورت کو چھوڑ دو۔ بادشاہ سے کہہ دینا کہ ہم نے اِسے جلا دیا۔“

انھوں نے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور پھر اشرفیاں لے کر چلے گئے۔ لڑکی نے شکریہ بھری نظروں سے رشید کو دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”نوجوان، اگر تُم میری جان نہ بچاتے تو میرا ابھی وہی حشر ہوتا جو میرے ساتھیوں کا ہوا۔ تُم اِس مُلک میں اجنبی معلُوم ہوتے ہو۔ کون ہو؟“

رشید نے اُسے بتایا کہ وہ ایک جہاز کا کپتان ہے اور کوئلا لے کر مصر جا رہا ہے تاکہ وہاں سے سامانِ تجارت خرید کر لائے۔

”کوئلا؟“ لڑکی حیرت سے بولی۔ ”اِس مُلک کے لوگ کوئلے پر جان دیتے ہیں اور اِسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں، تم اِنھیں جتنا کوئلا دو گے اُتنا ہی وہ تمھیں سونا دیں گے۔“



"اچھّا۔۔۔" رشید بھونچکا ہو کر بولا۔

"ہاں۔۔۔۔" لڑکی نے کہا۔ "تُم ایسا کرو کہ شہر کے سب سے بڑے سوداگر کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ میرے پاس کوئلے سے بھرا ہوا ایک جہاز ہے اور میں اِسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ وُہ خُوشی سے راضی ہو جائے گا اور تمہیں اِس کے بدلے سونا دے دے گا مگر ہوشیاری اور چالاکی کی ضرورت ہے۔ جیسے ہی سودا ہو جائے اور سونا تمہارے جہاز میں پُہنچ جائے، تُم جہاز کا لنگر اُٹھا دینا اور جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نِکل بھاگنے کی کوشش کرنا۔ اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو وحشی لوگ تمہیں زندہ نہ چھوڑیں گے اور تمہیں مار کر تمہارے جہاز اور سارے سامان پر قبضہ کر لیں گے۔"

رشید نے اُس کے مشورے پر چلنے کا وعدہ کیا۔ اور شہر کے سب سے بڑے سوداگر کے گھر پہنچا۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا اور جب رشید نے اُسے یہ بتایا کہ وہ ایک جہاز بھر کر کوئلا لایا ہے تو وُہ اُچھل پڑا اور بولا۔ "تو کیا آپ اُسے میرے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہیں؟ منہ مانگے دام دوں گا۔ آج ہی سودا ہو جائے تو اچھّا

ہے۔" رشید نے اُس سے کوئلے کے برابر سونا مانگا۔ سوداگر پہلے تو ہچکچایا مگر پھر راضی ہو گیا۔

"سونا کل صُبح چھ بجے میرے جہاز پر پُہنچ جائے۔" رشید نے سُوداگر سے کہا۔ "میں کنارے پر کوئلا ڈال دُوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا آیا۔ لڑکی بھی اُس کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ ساری گفتگو سُن کر وُہ بولی۔ "تُم اپنے آدمیوں کو ابھی سے تیّار رہنے کا حکم دے دو تاکہ جو نہی سونا جہاز پر آئے وُہ لنگر اُٹھا دیں۔ ذرا بھی دیر کی تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں بچا سکتی۔"

رشید نے اپنے سارے ملّاحوں کو تنبیہ کر دی کہ وُہ حکم ملتے ہی لنگر اُٹھا دیں۔ وُہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح ہوتے ہی سوداگر گاڑیوں میں سونا بھر کر آموجود ہوا۔ رشید نے پہلے ہی سے کوئلا کنارے پر اُتار دیا تھا۔ سارا سونا جہاز میں آگیا تو وہ چلّا کر بولا۔ "لنگر اُٹھاؤ؟"

حکم کی دیر تھی۔ جہاز چل پڑا۔ رشید نے دُوربین سے دیکھا کہ ہزاروں آدمی

لاٹھی، بلّم اور برچھے لیے کِنارے پر اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔

بوڑھا تاجر اور کپتان رشید کی گُم شدگی سے بڑے پریشان تھے۔ اُس کے دونوں ساتھی جہاز سمندر میں دھکے کھا کر واپس آ چُکے تھے مگر اُس کے جہاز کا پتا نہ تھا۔

جب رشید کا جہاز بندرگاہ میں پُہنچا تو بُوڑھا سوداگر اور کپتان خوشی سے پھُولے نہ سمائے۔ اور جب اُنہیں یہ معلُوم ہوا کہ وہ اپنے ساتھ لاتعداد سونا لایا ہے تو ان کی مسرّت کا ٹھکانا نہ رہا۔ بوڑھا سوداگر لڑکی کے ساتھ بڑی مہربانی اور محبّت سے پیش آیا اور اُس کی خوب خاطر مدارات کی۔ لیکن رشید دیکھتا کہ وہ کچھ چُپ چُپ غمگین سی رہتی ہے۔ آخر ایک دِن اُس نے پوچھ ہی لیا۔ وہ بجائے اِس کے کہ اُس کے سوال کا جواب دیتی بولی۔ ”کیا تُم اب کہیں نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں۔ کیوں؟“ رشید حیرانی سے بولا۔ ”میں اِتنے دِنوں بعد تو آیا ہوں۔ اب کچھ دِن آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کیوں؟ تمہارا کُچھ کام ہے؟“

”ہاں۔۔“ لڑکی سر جھُکا کر بولی۔ ”پہلے تم نے اپنے کام کے لیے سفر کیا تھا، اب میرے کام کے لیے سفر کرو گے۔ بولو کیا تُم ہسپانیہ جاؤ گے؟“

رشید جلدی سے بولا۔ ''اگر تمہارا کوئی کام ہے تو ضرور جاؤں گا۔ تم نے میرے اوپر وہ احسان کیا ہے جسے میں تمام عمر نہیں بھول سکتا۔''

''سب سے پہلے تُم ایک جہاز میں کُچھ سامان بھر لو اور اپنے مالک سے کہو کہ میں تجارت کے لیے ہسپانیہ جانا چاہتا ہوں۔ جب وُہ اِجازت دے دے تو پھر میرے پاس آنا۔ میں تمہیں چند باتیں بتاؤں گی۔''

رشید نے ایک جہاز میں کوئلا بھرا۔ پھر سوداگر سے ہسپانیہ جانے کی اجازت لے کر لڑکی کے پاس آیا اور بولا۔ ''جہاز تیّار ہے۔ اب بتاؤ کہنا چاہتی ہو؟''

لڑکی نے الماری میں سے ایک نہایت عمدہ کوٹ نکالا اور بولی۔ ''لو یہ کوٹ۔ جب تُم ہسپانیہ کے دارالسلطنت میں پُہنچ جاؤ تو اتوار کے دِن یہ کوٹ پہن کر شاہی گرجا گھر جانا۔ وہاں پادری کے منبر کے قریب تین کُرسیاں پڑی ہوں گی۔ دو سونے کی اور ایک چاندی کی۔ تُم چاندی کی کُرسی پر بیٹھ جانا۔ یہ ایک انگُوٹھی اور ایک کتاب اور لو۔ انگُوٹھی کو داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہن لینا اور کرسی پر بیٹھ کر یہ کتاب پڑھنی شروع کر دینا۔ اگر بادشاہ یا ملکہ تُم سے بات کرے تو خاموشی سے

اُٹھ کر باہر چلے جانا۔ پھِر اِنتظار کرنا کہ کیا ہوتا ہے۔" رشید نے لڑکی کی بتائی ہوئی باتوں کو خُوب ذہن نشین کر لیا اور جہاز میں سوار ہو کر ہسپانیہ کی طرف چل پڑا۔

تین ہفتے بعد وہ ہسپانیہ کی بندرگاہ میں پُہنچا۔ پھر وہاں سے سیدھا دارالسلطنت گیا اور ایک سرائے میں جا ٹھہرا۔ اتوار کا دِن آیا تو وُہ لڑکی کا دیا ہُوا کوٹ پہن کر گرجاگھر پُہنچا۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ تمام گرجا افسروں اور امیروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رشید بڑے وقار سے چلتا ہُوا سب سے آگے چاندی کی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ اور ملکہ بھی آ گئے اور رشید کی داہنی طرف والی سونے کی کرسیوں پر بیٹھ گے۔ دُعا شرُوع ہو گئی۔

رشید نے جلدی سے لڑکی کی کتاب جیب سے نِکالی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ سطروں پر اُنگلی بھی پھیرتا جاتا جس میں لڑکی کی دی ہوئی انگُوٹھی پہنے ہوئے تھا۔ سارے لوگ دُعا میں مشغُول تھے مگر بادشاہ اور ملکہ رشید کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملکہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی

اور وُہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

رشید اُسے روتا دیکھ کر ایک دم باہر نِکل آیا اور سرائے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد تین سپاہی آئے اور اُس سے کہا کہ بادشاہ سلامت آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ رشید نے کہا۔ ”میں شام کو حاضر ہوں گا۔“

جب وُہ شام کو شاہی محل پہنچا تو بادشاہ اور ملکہ بے چینی سے اُس کا اِنتظار کر رہے تھے اُسے دیکھتے ہی دونوں کھڑے ہو گئے۔ رشید شرمندہ ہو کر بولا۔ ”حضور مُجھے خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ میں حضور کی تنظیم بجالاؤں۔“

”نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ بادشاہ بولا۔ تُم ہمارے مہمان ہو۔ کیا آج شام کا کھانا تُم ہمارے ساتھ کھاؤ گے؟“

”میری مجال ہے کہ میں اِنکار کروں۔“ رشید نے ادب سے جواب دیا اور بادشاہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ جب تینوں بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے تو ملکہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”نوجوان، میں تُم سے ایک بات پُوچھتی ہوں۔ سچ سچ جواب دو گے؟“

"ضرور ملکہ عالیہ۔"

ملکہ بولی۔ "کیا وہ کوٹ، انگوٹھی اور کتاب تمھیں کسی لڑکی نے دی تھی؟"

"جی ہاں۔ آپ کا فرمانا درست ہے۔" رشید نے جواب میں کہا۔

"آہ تو پھر۔ پھر۔" ملکہ آنسو پُونچھ کر بولی۔ "تو پھر وُہ کہاں ہے؟ خُدا کے لیے مُجھے اُس کا پتا بتا دو۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ میری لڑکی ہے۔"

رشید بولا۔ "میں نے اُسے ایک عجیب و غریب جزیرے میں وحشیوں کے نرغے سے بچایا تھا۔ وُہ لوگ اُسے آگ میں جلا رہے تھے، اب وہ میرے وطن میں ہے اور میرے باپ کے پاس آرام سے رہ رہی ہے۔"

"اُس کے ساتھ کُچھ اور آدمی بھی تھے؟" ملکہ نے جلدی سے پُوچھا۔

"نہیں۔" رشید نے جواب دیا۔ "وہ کہتی تھی کہ میرے ماں باپ کو اِن وحشیوں نے جلا دیا۔ افسوس میں ایک دن دیر سے پُہنچا۔"

"آہ۔" ملکہ بولی۔ "وُہ اُس کے ماں باپ نہیں تھے، نوکر تھے۔ وہ ضرُور میری بچّی

ہے۔ میری بچّی۔" ملکہ کی آواز بھرّا گئی اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

رشید نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور ملکہ کو دِلاسا دے کر بولا۔ "مگر وہ آپ سے جُدا کیسے ہُوئی؟"

ملکہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "پانچ سال ہوئے بحری جہاز میں تُرکی جا رہے تھے۔ اِتنے میں کِسی نا معلُوم جگہ پر بحری لُٹیروں نے ہمارا جہاز لُوٹ لیا۔ سامان کے ساتھ وہ شہزادی کو بھی چند نوکروں کے ساتھ اُٹھا لے گئے۔ میں نے اور جہاں پناہ نے بڑی مُشکل سے جان بچائی۔ جب سے آج تک اُس کا پتا نہیں۔ تمہارے پاس یہ چیزیں ہیں وُہ اُسی کی ہیں۔ اِن سے معلُوم ہوتا ہے کہ وہ ضرُور ہماری لڑکی ہے۔ آہ میری بچّی۔" اِتنا کہہ کر ملکہ دم لینے کے لیے رُکی اور پھر بولی۔ ""نوجوان، تُم فوراً واپس جاؤ اور شہزادی کو لے آؤ۔ میں بادشاہ سلامت کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے ساتھ اُس کی شادی کر دی جائے گی۔"

"شکریہ ملکہ عالیہ۔" رشید سر جھکا کر بولا۔ "میں نے جو کام کیا ہے وہ کِسی لالچ سے نہیں کیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ آپ ایک جہاز میرے ساتھ کر دیجیے۔ میں آپ کی

شہزادی آپ کو واپس پہنچا دُوں گا۔"

بادشاہ کے وزیروں اور امیروں کو اِس واقعے کی خبر ہوئی تو اُنہیں یہ جان کر بُہت غُصّہ آیا کہ ایک اجنبی اُن کے مُلک کی شہزادی سے شادی کرنے والا ہے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور وہ جہاز جو رشید کے ساتھ جا رہا تھا اُس کے کپتان کو بہت سی رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ موقع ملتے ہی اُس کا کام تمام کر دے۔

"جاتے میں تو کپتان نے رشید سے کچھ نہ کہا۔ مگر جب جہاز شہزادی کو لے کر ہسپانیہ کی طرف واپس چلا تو اب کپتان رشید کو ٹھکانے لگانے کا موقع تلاش کرنے لگا۔

ایک دن صُبح کے وقت رشید جہاز کے عرشے پر دُور بین لیے ٹہل رہا تھا کہ اُسے کُچھ فاصلے پر ایک نہایت خُوب صُورت جزیرہ دِکھائی دیا۔ سمندر بالکُل پُر سکون تھا۔ اُس نے کپتان کو حکم دیا کہ جہاز روک لو۔ میں جزیرے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ کپتان کی آنکھیں خُوشی کے مارے چمک اُٹھیں۔ وُہ تو ایسے موقع کی تلاش ہی میں

تھا۔ جزیرے سے کُچھ فاصلے پر جہاز روک دیا گیااور رشید ایک کشتی میں بیٹھ کر تن تنہا جزیرے میں اُتر گیا۔

اُس کے اُترتے ہی کپتان نے جہاز کا لنگر اُٹھادیااور جہاز ہسپانیہ کی طرف چل پڑا۔

شہزادی اِن سب باتوں سے بے خبر تھی۔ وہ رات گئے تک رشید کا انتظار کرتی رہی۔ کپتان نے یہ کہہ کراُس کو تسلّی دی کہ وہ دوسرے جہاز میں آرہاہے۔

شہزادی کا جہاز ہسپانیہ کی بندرگاہ میں پُہنچا تو بادشاہ اور ملکہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ شہزادی کا رشید کی جدائی میں بُرا حال تھا۔ وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی تھی۔ بادشاہ بھی اپنے محسن کی گمشُدگی سے غم گین تھا۔ کپتان نے اُسے کُچھ ایسی من گھڑت کہانی سُنائی کہ وہ اُس پر شُبہ نہ کر سکا۔

اِدھر رشید اُس سنسان اور غیر آباد جزیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ تھوڑی دُور اِدھر اُدھر گھُوم کر وہ واپس ساحل پر آیا تو جہاز کا دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ وُہ مغموم اور افسُردہ کنارے ہی پر لیٹ گیا۔

ایک مہینہ ہو گیا۔ رشید صُبح سے شام تک کنارے پر بیٹھا رہتا کہ کوئی جہاز آتا جاتا دِکھائی دے تو اُسے مدد کے لیے پُکارے مگر افسوس اُس کی اُمّید پوری نہ ہوئی۔ اس کے کپڑے پھٹ پھٹا کے برابر ہو گئے تھے۔ سر کے بال اور ناخُن اِتنے بڑھ گئے تھے کہ اُس کی صورت دیکھ کر خوف آتا تھا۔

ایک رات وُہ کنارے پر بیٹھا اپنی تقدیر کو رو رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی کشتی آ کر ٹھہری اور چاند کی روشنی میں اُسے ایک آدمی کا چہرہ نظر آیا جو اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"کیا تُم ہی رشید ہو؟" کشتی والے نے پُکار کر کہا۔ لیکن رشید سوچ میں ایسا غرق تھا کہ اُس نے بالکل نہیں سُنا۔

اس پر وہ آدمی اور زیادہ چیخ کر بولا۔ "کیا تُم بہرے ہو؟ سُنتے کیوں نہیں؟"

رشید چونک پڑا اور بھاگتا ہوا کشتی کے پاس گیا۔

"کیا تم رشید ہو؟" ملّاح نے پُوچھا۔

”ہاں میں رشید ہی ہوں۔“اُس نے جلدی سے جواب دیا۔

”کیا تُم یہاں سے جانا چاہتے ہو؟“ آدمی بولا۔

”اگر تُم مجھے یہاں سے لے جاؤ تو میں تمہارا بُہت شُکر گزار ہوں گا۔“ رشید خُوش ہو کر بولا۔

آدمی بولا۔ ”مگر اِس کے بدلے میں تُم مُجھے کیا دو گے؟“

رشید کا چہرہ اُتر گیا۔ میرے پاس تو پھُوٹی کوڑی تک نہیں۔

”میں اس وقت نہیں مانگتا۔“ آدمی بولا۔ ”جب تُم صحیح سلامت اپنے وطن پُہنچ جاؤ تب۔“

”اگر میں اپنے وطن پُہنچ گیا تو جُو مانگو گے دوں گا۔“ رشید نے کہا۔

”اچھّا تو پھر کشتی میں آ جاؤ۔“ آدمی نے سہارا دے کر اُسے کشتی میں بٹھا لیا اور کشتی کھیتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے وطن جانا چاہتے ہو یا ہسپانیہ؟“

”ہسپانیہ۔“ رشید نے جواب دیا۔ کشتی زور زور سے چلنے لگی۔

رات بھر کشتی چلتی رہی۔ صُبح کو دس بجے کے قریب وہ ہسپانیہ کی بندر گاہ پر جا کر رُکے۔ آدمی کشتی میں سے اُتر کر بولا۔ میرا کام ختم ہوا۔ لو یہ کُچھ روپیہ ہے۔ اِس سے تُم اپنی حالت سنوارنا۔ جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے تو پھر میں تمہارے پاس آؤں گا۔"

رشد روپیہ لے کر پہلے نائی کی دُکان میں پُہنچا اور اپنا حُلیہ ٹھیک کرایا اور پھر نئے کپڑے خرید کر اُسی سرائے میں گیا جِس میں وُہ پہلے ٹھہرا تھا۔ شام ہوئی تو وُہ شاہی محل پُہنچا اور شہزادی کو اِطّلاع کرائی۔ وُہ اُس کا نام سُنتے ہی اُچھل پڑی۔ بادشاہ اور ملکہ کو یہ خبر ملی تو وہ بھی باغ باغ ہو گئے۔

تھوڑے دِن بعد رشید اور شہزادی کی شادی ہو گئی۔ شادی میں اُس کا مُنہ بولا باپ کپتان اور سوداگر بھی شریک تھے۔ کپتان نے ساتھ ایک بُڑھیا کو بھی لایا تھا اور جب اُس نے رشید کو بتایا کہ یہ بڑھیا تمہاری ماں ہے تو وہ اُس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

شادی سے ایک ہفتہ بعد رات کو وہ سو رہا تھا کہ کسی نے اُسے جگا دیا۔ وُہ آنکھیں ملتا

ہُوا اُٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے سامنے وہی آدمی کھڑا ہے جو اُسے کشتی میں سوار کر کے ہسپانیہ لایا تھا۔

"کہو رشید، تُمھیں اپنا وعدہ یاد ہے؟" وُہ مُسکرا کر بولا۔

"بالکل۔۔۔" رشید نے جواب دیا۔ "بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ جو مانگو گے دُوں گا۔"

آدمی نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "میں اس کے سوا اور کُچھ نہیں چاہتا کہ تُم دُنیا میں پھلو پھُولا۔ تمھیں یاد ہو گا کہ ایک دفعہ تُم نے وحشیوں کے ہاتھوں ایک غریب قرض دار کی لاش بچائی تھی۔ میں اُسی کی روح ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا۔

رشید کُچھ دِن ہسپانیہ میں رہا اور پھر اپنی دُلہن کو لے کر وطن واپس آ گیا۔ اب سوداگر بُہت بُوڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے سارا کاروبار رشید کو سونپ دیا اور خود گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگا۔

قسمت کا چکّر

سیکڑوں برس ہوئے، لاہور سے کُچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی جہاں ایک راجاراج کرتا تھا۔ اس کی تین لڑکیاں تھیں۔ تینوں خُوب صُورتی اور عقل مندی میں اپنا جواب آپ تھیں، مگر ایک چیز جو چھوٹی راج کُماری اِندرا کو اپنی بڑی بہنوں سے الگ کرتی تھی وُہ نیکی، پارسائی اور خُدا ترسی تھی۔ جہاں دونوں بڑی بہنیں غرور اور تکبّر کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں، وہاں خُدا نے راج کُماری اِندرا کو نیکی اور رحم دِلی جیسی اچھّی صفتیں عطا کی تھیں۔ اس کے چہرے پر فرشتوں جیسا نور برستا تھا جس سے اُس کی خُوب صُورتی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

تینوں راج کُماریاں جوان ہُوئیں تو اِرد گرد کی ریاستوں کے راج کُماروں کے پیغام آنے لگے۔ راجا نے بڑی چھان بین کے بعد تین راج کُماروں کو پسند کیا اور اُنہیں بر دِکھاوے کے لیے اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دی۔

ایک دِن راجا تینوں راج کُماروں اور راج کُماریاں کے ساتھ شہر سے دُور ایک جھیل کے کنارے تفریح کر رہا تھا۔ صُبح کا سُہانا وقت تھا۔ طلُوع ہوتے سورج کی چمکیلی کرنیں جھیل کے صاف و شفاف پانی پر اٹکھیلیاں کر رہی تھیں، پرندے پیڑوں کی شاخوں پر بہار کا ترانہ الاپ رہے تھے کہ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ایک فقیر ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی دردناک آواز میں بولا۔ "بابا۔ کُچھ خُدا کے نام پر دو۔ تین دِن سے بھُوکا ہوں۔"

اِس پر بڑا راج کُمار آگے بڑھا اور جھِڑک کر بولا۔ "بھاگ جا یہاں سے۔ اور یہ کہ کر اُسے اِتنا زور کا دھکّا دیا کہ وہ غریب لُڑھکنیاں کھاتا ہُوا ایک پتھّر پر گِر پڑا جس سے سر پھٹ گیا۔ راج کُماری اندرا اور راج کُمار اندر جیت باتیں کرتے ہُوئے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ اِندرا نے فقیر کی یہ گُت بنتی دیکھی تو اُس کا دِل بھر آیا۔ دوڑی ہُوئی فقیر کے پاس گئی، سہارا دے کر اُٹھایا، سر سے خون کو پُونچھا اور اپنے گلے سے ہیروں کی مالا اُتار کر دے دی۔ غریب بھکاری کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وُہ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے دُعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

راجا پھر تفریح میں مشغول ہو گیا۔ گویا کُچھ ہُوا ہی نہیں۔ لیکن اُس نے دِل ہی دِل میں اِندرا کی رحم دلی کی تعریف کی۔ یکا یک بڑی راج کُماری جھِیل کی طرف اِشارہ کر کے بولی۔ "وُہ کیا ہے؟"

سب کی نگاہیں اُسی طرف اُٹھ گئیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ جھیل کے کنارے ایک نہایت خُوب صُورت کشتی چاندی کی زنجیر سے بندھی کھڑی ہے۔ اُس کا سُنہرا رنگ سونے کو بھی مات کر رہا تھا۔ بڑی راج کُماری کی آنکھیں خُوشی سے چمکنے لگیں اور وہ مُٹھّیاں بھینچ کر اپنی منجھلی بہن سے بولی۔ "کُسم، دیکھو تو کِتنی خُوب صُورت کشتی ہے۔ معلُوم ہوتا ہے خُدا نے ہمارے لیے جنّت سے بھیجی ہے۔ دِل چاہتا ہے کہ اِس میں سوار ہو کر تھوڑی دیر لُطف اُٹھائیں۔ کیا تُم میرے ساتھ چلو گی؟"

کُسم راضی ہو گئی مگر اندرا بولی۔ "نہ معلوم کِس کی کشتی ہے اور یہاں کیوں کھڑی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں بعد میں پچھتانا پڑے۔"

بڑی بہن بولی۔ "اُونہہ تُمھیں تو ذرا ذرا سی باتوں سے ڈر لگتا ہے۔ آؤ بس تھوڑی

دُور گھوم کر واپس آ جائیں گے۔"

اِندرا کا دِل دھک دھک کر رہا تھا۔ وُہ کشتی میں سوار ہونے کو تیّار نہ تھی مگر دونوں بہنوں نے زبردستی کھینچ کر اُسے بھی اپنے ساتھ بِٹھالیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ زنجیر کھول کر کشتی کو آگے بڑھائیں کہ۔ گہرے پانی میں بڑے زور کا دھماکا ہُوا۔ ایک بونا چھلانگ مار کر کشتی پر چڑھ گیا اور بڑی خوفناک آواز نکال کر بولا۔ "چلے چلو۔۔۔"

راجا کی آنکھیں خوف کے مارے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ راج کُماروں نے تلوار نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر اُنہیں ایسا معلُوم ہُوا جیسے کِسی نے اِن کی طاقت چھین لی ہے اور اُنہیں پتھّر کے بُت بنا دیا ہے۔

بونے نے ہاتھ بڑھا کر زنجیر کھول دی اور جھیل کے نیلے پانی میں کشتی کرتے ہوئے بولا۔ "اچھّا میرے دوستو، خُدا تمہیں صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ تُمہیں اب معلُوم ہو گیا ہو گا کہ کِسی غریب کا دِل دُکھانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ تُم سمجھتے تھے کہ تُم راجا ہو اور دُنیا کی کوئی طاقت تمہارا کُچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مگر اب تُم سمجھ

گئے ہو گے کہ خُدا نے دُنیا میں تُم سے بھی بڑی طاقتیں پیدا کی ہیں۔۔۔ اچھّا مہاراج چُونکہ تمہاری چھوٹی لڑکی بہت رحم دِل اور نیک ہے اِس لیے وُہ تو تمہیں تھوڑے دِنوں بعد واپس مل جائے گی مگر یہ دونوں راج کُماریاں کبھی واپس نہ آ سکیں گی۔"

یہ سب کُچھ اتنے تھوڑے عرصے میں ہُوا کہ راجا ٹھیک طور پر سمجھ بھی نہ سکا کہ یہ کوئی خواب ہے یا حقیقت۔ چاروں کنارے پر کھڑے خوف بھری نگاہوں سے غائب ہوتی کشتی کو دیکھ رہے تھے۔ مُنہ پر قفل لگے ہُوئے تھے۔ ہاتھ بے جان ہو چکے تھے۔ بس آنکھیں کھُلی ہُوئی تھیں۔

اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے بونا کشتی کو تیز تیز کھیتا دُوسرے کنارے پر ایک کنویں کے پاس لے گیا اور زور سے دہاڑ کر بولا۔ "ہانگ ہونگ شانگ شونگ۔"

فوراً ہی ایک ٹوکری جس میں مضبُوط سی رسّی بندھی ہوئی تھی کنوئیں کے مُنہ پر آئی اور بونا تینوں راج کُماریوں کو ٹوکری میں بٹھا کر کنویں کی گہرائی میں غائب ہو گیا۔



جب بونا اور راج کُماریاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو راجہ اور راج کُماروں کو محسوس ہوا کہ اُن کی کھوئی ہوئی طاقت واپس آ گئی ہے اور وُہ پہلے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتے ہیں۔

"یہ کیا ہوا؟" راجا چیخ کر بولا۔ "اب کیا کریں؟"

"آیئے یہ موقع وقت ضائع کرنے کا نہیں۔" راج کُمار اِندر جیت نے جلدی سے کہا۔ "ہمیں کنوئیں پر پُہنچنا چاہیے۔ شاید کُچھ نِشان مِل جائے۔"

چاروں تلواریں سونت کر جھِیل کے کنارے کنارے دوڑنے لگے۔ کنوئیں پر پہنچ کر اُنہوں نے دیکھا کہ ٹوکری تو لٹک رہی ہے مگر نہ تو راج کُماریوں کا کُچھ پتا ہے اور نہ اُس خبیث بونے کا۔ کنوئیں میں گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راجا کی آنکھوں میں مایوسی جھلکنے لگی۔ سب سے پہلے راج کُمار اِندر جیت کے حواس ٹھکانے آئے اور وہ بڑے جوش سے بولا۔ "میں ٹوکری میں بیٹھ کر کنوئیں میں جاتا ہوں۔ آپ لوگ محل جایئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک راج کُماریوں کو واپس نہ لے آؤں گا اپنی صُورت نہ دِکھاؤں گا۔"

اِندر جیت کا حوصلہ دیکھ کر بڑے راج کمار کو بھی جوش آ گیا۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ’’ٹھہرو۔ تُم نہیں۔۔ میں۔۔ کیونکہ میں سب سے بڑا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ چھلانگ لگا کر ٹوکری میں بیٹھ گیا اور آن کی آن میں کنوئیں کی ہیبت ناک گہرائی میں گُم ہو گیا۔ راجا اور راج کُمار بُہت دیر تک راج کُمار کی راہ دیکھتے رہے مگر کوئی ایسی آواز سُنائی نہ دی جِس سے معلُوم ہوتا کہ کوئی کنویں کے اندر ہے۔ راجا نے کنویں کے اندر مُنہ ڈال کر اپنی پُوری طاقت سے راج کُمار کو آواز دی مگر اُس کی اپنی آواز ہی کنوئیں میں گونج کر رہ گئی۔

شام کی تاریکی چھانے لگی۔ راجا اور راج کُماروں کا بھُوک کے مارے بُرا حال تھا۔ مجبوراً گھر لوٹے کہ کُچھ کھا پی لیں اور پھر واپس آ کر راج کُمار کا اِنتظار کریں۔

دوسرے دِن صُبح تڑکے ہی راجا راج کُماروں اور بہت سے سپاہیوں کے ساتھ کنوئیں پر پہنچا لیکن یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوا کہ ٹوکری تو کنوئیں کے مُنہ پر لٹک رہی ہے مگر راج کُمار اور راج کُماریوں کا کُچھ پتا نہیں۔ راج کُماریوں کا غم ہی کیا کم تھا کہ مہمان راج کُمار سے بھی ہاتھ دھونے پڑ گئے۔

راجا کو پریشان دیکھ کر منجھلے راج کُمار نے کنوئیں میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ راجا نے پہلے تو بُہت روکا مگر جب اُس نے ضِد کی تو اِجازت دے دی اور وہ بھی پہلے راج کُمار کی طرح کنوئیں کی ہولناک تاریکی میں غائب ہو گیا۔

تیسرے دِن چھوٹے راج کُمار اِندر جیت نے کمر باندھی۔ راجا کے آنسو نکل آئے۔ وہ بولا۔ ”بیٹا! تین بیٹیاں کھو چُکا ہوں۔ دو مہمان گنوا دیے۔ اب تو بھی جا رہا ہے۔ تیرے باپ کو کیا مُنہ دِکھاؤں گا۔“

اِندر جیت تسلّی دے کر بولا۔ ”آپ فِکر نہ کریں۔ قُدرت کو منظور نہ ہوا تو بہت جلد واپس لوٹوں گا۔ میرا دِل کہہ رہا ہے کہ یہ مُہم میرے ہاتھوں سر ہو گی۔“

راجا نے چارو ناچار اُسے بھی رُخصت کیا اور خُود روتا محل کو چلا آیا۔

اِندر جیت ابھی ٹوکری میں سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ نیچے سرکنا شُروع ہو گئی۔ وُہ قسمت پر بھروسا کیے کنوئیں کے ہیبت ناک اندھیرے میں سے گُزر رہا تھا۔ ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا اور دُوسرا رسّی کو مضبُوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

تھوڑی دُور جانے کے بعد اُسے ایک طرف دِھیمی دِھیمی سی روشنی نظر آئی۔ پھِر جُوں جُوں ٹوکری نیچے سرکتی گئی روشنی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ٹوکری ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔ وُہ سمجھ گیا کہ تہہ آگئی۔ یہ عجیب و غریب کُنواں تھا۔ اِس میں پانی کی ایک بوند نہ تھی۔ وُہ جلدی سے ٹوکری سے کُود کر روشنی کی طرف بڑھا۔ پاس جا کر معلُوم ہُوا کہ دروازہ ہے اور اس کی جھریوں میں سے روشنی آرہی ہے۔ اس نے دروازے کو زور سے دھکّا دِیا تو وہ ایک ہی جھٹکے میں کھُل گیا۔ اب اُس کی نظروں کے سامنے ایک نہایت خُوب صُورت اور حسین منظر تھا۔

اُس نے دیکھا کہ وہی آسمان ہے اور وہی زمین ہر طرف نرم نرم گھاس کا فرش بِچھا ہُوا تھا۔ ننّھی رنگ برنگی خُوب صُورت چِڑیاں درختوں پر پھُدک رہی تھیں اور میدان میں طرح طرح کے جانور بڑی آزادی اور اِطمینان سے چرتے پھِر رہے تھے لیکن کوئی آدم زاد نظر نہ آتا تھا۔ میدان کے اس طرف ایک خوش نُما باغ تھا جِس میں ایک نہایت خُوف صُورت محل بنا ہُوا تھا۔ یہ دِل فریب اور پیارا

سماں دیکھ کر راج کُمار کا دِل بلّیوں اُچھلنے لگا اور وہ بے اختیار محل کی طرف بڑھا چلا گیا۔

وُہ سوچنے لگا شاید یہ وہی سدا بہار مُلک ہے جِس کے مُتعلّق ہم بچپن سے کہانیوں میں سُنتے چلے آئے ہیں کہ یہاں نہ کوئی دُکھ درد ہے اور نہ غم۔ سب لوگ خوش و خرّم رہتے ہیں نہ کبھی بیمار پڑتے ہیں اور نہ مرتے ہیں۔ ہمیشہ سے زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

وُہ اسی طرح سوچتا ہُوا محل کے دروازے کے پاس پہنچا اور سوچنے لگا کہ اندر جائے یا نہ جائے کہ اِتنے میں محل کا پھاٹک خُود بخُود کھُل گیا اور ایک نہایت میٹھی اور پیاری آواز آئی۔ "تشریف لایئے۔۔۔۔"

وہ محل کی سجاوٹ اور قیمتی سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ایسے بڑھیا قالین اور اِتنی نفیس میز کرسیاں خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ وُہ جب کِسی کمرے کے دروانے کے قریب پُہنچتا تو وہی دِل لُبھانے والی آواز آتی۔ "تشریف لایئے۔" اور وُہ بغیر کِسی جھجک یا خوف کے اندر گھُس جاتا جیسے یہ اُس کا

ہی محل ہے۔ محل کی خُوب صُورتی سے تو اس کا دِل باغ باغ ہو رہا تھا مگر اِس چیز سے اُسے سخت پریشانی اور اُلجھن ہو رہی تھی کہ آخر اس محل میں کون رہتا ہے؟

اب وہ گھُومتے گھُومتے تھک گیا تھا، اِس لِیے ایک مسہری پر سستانے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ سونا چاہتا ہی تھا کہ طرح طرح کے کھانوں کی خُوش بُو سے سارا کمرہ مہک اُٹھا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک میز پر سونے چاندی کے برتنوں میں قسم قسم کے لذیذ کھانے چُنے رکھے تھے۔ صُبح کے ناشتے کے بعد اُس کے حلق سے ایک دانہ بھی نہ اُترا تھا۔ بھُوک کے مارے آنتیں اینٹھی جا رہی تھیں۔ بے تابی سے کھانے کی طرف لپکا اور چاہتا تھا کہ ایک ہی لُقمے میں ساری پلیٹ حلق میں اُتار لے کہ فوراً ہی خیال آیا، خُدا جانے اِس محل کا مالک کون ہے اور یہ کھانا یہاں کیوں رکھا ہے؟ بِلا پُوچھے کِسی کا کھانا کھا لینا ایمانداری کے خلاف ہے۔ یہ سُوچ کر وُہ بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کوئی آئے اُسے کھانے کے لیے کہے تو کھائے۔

یکایک پاس کے آتش دان میں آگ بھڑکنے لگی۔ اور اُس کے اُٹھتے ہوئے شُعلوں میں اِندر جیت کو اُسی خوفناک بونے کا مُسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا جو راج

کُماریوں کو کشتی میں بٹھا کر اِس عجیب و غریب دُنیا میں لے آیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اِندر جیت کی تھر تھری بندھ گئی۔ بونا اُسے ڈرتا ہوا دیکھ کر نرمی سے بولا۔

''ڈرو نہیں میرے ننّھے راج کُمار۔ میں اچھّے لوگوں کا دوست اور بُروں کا دُشمن ہوں۔ تُم اِتنی دُور سے چل کر یہاں آئے ہو۔ صُبح سے تُم نے کُچھ بھی نہیں کھایا۔ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

راج کُمار ڈرتے ڈرتے بولا۔ ''جانے یہ کِس کا کھانا ہے؟ بغیر پُوچھے کِسی کی کوئی چیز کھالینا تو بُری بات ہے۔''

''ہاہاہا۔'' بونا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''تمہاری ایمانداری کی میں تعریف کرتا ہوں مگر افسوس ہے کہ تمہارے دونوں دوست جو تم سے پہلے یہاں آئے تھے تُم جیسے ایمان دار نہ تھے۔ وہ کھانے کو دیکھتے ہی ٹُوٹ پڑے اور اب وہ ایسی حالت میں ہیں کہ اُنہیں نہ بھُوک لگتی ہو گی اور نہ پیاس۔۔۔وُہ دیکھو۔''

بونے نے ایک طرف اِشارہ کیا اور راج کُمار کا یہ دیکھ کر خون خُشک ہو گیا کہ راج کُماروں جیسی صُورت کے پتھّر کے دو بُت رکھّے ہیں۔

"مگر تُم نہ گھبراؤ۔" بونا بولا۔ "میں تم سے بُہت خُوش ہوں۔ آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔ تُم میرے مہمان ہو۔ اِیمان دار مہمان۔"

یہ کہہ کر وہ آتش دان میں سے نِکل کر قہقہے مارتا ہُوا کھانے کی میز پر بیٹھ گیا اور راج کُمار کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھی اپنے ساتھ بِٹھالیا۔

اِندر جیت نے یہ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ بونا ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "نا۔ نا۔ پہلے کھانا کھالو۔ میں جانتا ہوں کہ تُم کِس لیے یہاں آئے ہو۔ اِطمینان رکھو تمہاری راج کُماری میرے پاس بِالکُل محفُوظ ہے۔ اُسے تو میں یُونہی اپنے ساتھ لے آیا تھا ورنہ اُس نیک دِل لڑکی کے ساتھ مُجھے کوئی دُشمنی نہیں۔ رہیں دُوسری راج کُماریاں، سو اگرچہ اُن سے میں سخت ناراض ہوں لیکن صِرف تمہاری اور راج کُماری اِندرا کی خاطر اُن کا قصُور معاف کرنے کو تیّار ہوں۔ اگر تُم مُجھ سے وعدہ کرو کہ اُن کو نیک دِل لڑکیاں بنا سکو گے تو میں تُمھیں اُن کا پتا بتا دوں گا۔"

راج کُمار بولا۔ "میں اِس کا وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ کبھی وُہ کسی غریب کا دِل نہ دکھائیں گی۔"

"اچھّا تو کل صُبح میں اُن کا پتا بتا دُوں گا۔ اب تُم آرام کرو۔" یہ کہہ کر بونا چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا اور راج کُمار مسہری پر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

صُبح کو اِندر جیت کی آنکھ کھُلی تو اُس نے دیکھا کہ بونا اُس کے سرہانے بیٹھا اُسے گھُور گھُور کر دیکھ رہا ہے۔ وُہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ بونا آہستہ سے بولا۔ "تُم صبح کو بہُت دیر سے اُٹھتے ہو۔ یہ بہت بُری عادت ہے۔ اچھّا اب دھیان دے کر میری بات سُنو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی ڈاڑھی سہلانے لگا۔ پھر آگے کو جھک کر بولا۔ "میرے دوست! تُم اگر ہمّت سے کام لو گے تو راج کُماریوں کو حاصل کر سکو گے۔ سُنو۔۔۔ وُہ دونوں دیووں کے قبضے میں ہیں۔ میں جب اُنہیں لایا تھا تو وہ مُجھ سے چھین کر لے گئے تھے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تُم اُن کو دیووں کے پنجے سے چھڑاؤ۔ یہاں سے ۵۰ میل دُور میرے مُلک کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور پرستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ سرحد سے کُچھ ہی فاصلے پر دیووں کے بادشاہ کا محل ہے جس کے پاس منجھلی راج کُماری قید ہے۔ جب تُم اُسے چھڑا لو تو اُس سے ۵۰ میل دُور

دُوسرے دیو کا محل ہے اور وہاں بڑی راج کُماری قید ہے۔ جب اِن دونوں کو رہا کرالو تو سیدھے میرے پاس آنا۔ میں چھوٹی راج کُماری کو بھی تمہارے سپُرد کر دُوں گا مگر یہ بڑی ہوشیاری اور جوانمردی کا کام ہے۔ ذرا سی بھُول چُوک یا بے ہمتّی سے بنابنایا کام بگڑ جائے گا اور تمہاری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔" اِتنا کہہ کر وہ راج کُمار کا ہاتھ پکڑ کر اصطبل میں لے گیا اور اُسے ایک نہایت تیز رفتار گھوڑا دیا۔ جس پر بیٹھ کر راج کُمار دیو کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

دِن بھر لگاتار چلنے کے بعد راج کُمار شام کے قریب محل کے پاس پُہنچا۔ راج کُماری کُسم اُسے دیکھتے ہی دوڑ پڑی۔ اِندر جیت نے شروع سے اخیر تک سارا قصّہ سُنایا، تسلّی دی اور بتایا کہ اب میں تُمھیں لینے آیا ہوں۔ جلد تیّار ہو جاؤ۔"

راج کُماری بولی۔ "یہ وقت جانے کا نہیں کیونکہ دیو آتا ہی ہو گا۔ اس رات تو تم یہیں رہو، صُبح کو جب وہ سیر و شکار کو نِکل جائے گا تو ہم بھاگ نِکلیں گے۔"

راج کُمار کو بھُوک لگ رہی تھی جب راج کُماری نے اُس کے آگے کھانا لا کر رکھا تو وہ دیوانوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ مگر ابھی آدھے پیٹ ہی کھانے پایا ہو گا کہ بڑے

زور کی گرج سُنائی دی اور ساتھ ہی سارا محل تھر تھر کانپنے لگا۔ راج کُمار نے خوف زدہ نگاہوں سے راج کُماری کو دیکھا۔

وُہ گھبرا کر بولی۔ ''وُہ کم بخت آ رہا ہے۔ تُم اِس الماری کے پیچھے چھُپ جاؤ۔ جب وُہ کھانا کھا کر سو جائے گا تو میں تمہیں نِکال لُوں گی۔''

راج کُمار جلدی سے الماری کے پیچھے چھُپ گیا۔ اِتنے میں دیو بھی آ پہنچا۔ اُس کی پیٹھ پر گائے، بکرا اوہ ایک ہرن بندھا ہُوا تھا۔ ''آج شکار مِلنے میں بڑی دِقّت ہوئی۔'' وُہ گرج کر بولا۔ ''خیر آج آدھا پیٹ ہی سہی۔ صُبح کو دیکھا جائے گا۔''

یہ کہہ کر اُس نے جلدی جلدی سارا شکار ہڑپ کر لیا اور پھر وہاں فرش پر اوندھا لیٹ کر سو گیا۔ راج کماری نے آہستہ سے راج کُمار کو کمرے سے باہر نِکالا اور اُسی طرح دبے پاؤں اُسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

صُبح کو جب دیو شکار کی تلاش میں جنگل کی طرف چلا گیا تو راج کُماری نے اِندر جیت کو اُس محل کا پتا بتایا جہاں اُس کی بڑی بہن قید تھی۔ راج کُمار بولا۔ ''میں راج کُماری کو لے کر کل صُبح تک یہاں پُہنچ جاؤں گا۔ تُم گھوڑے پر زین کَس کر تیّار

رہنا۔ کیونکہ ہم نے اگر ذرا سی بھی دیر کی تو پھر ہمارا خُدا ہی حافظ ہے۔" یہ کہہ کر وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔

دوپہر کے وقت وہ اس محل میں پہنچا جہاں بڑی راج کُماری قید تھی۔ دیو باہر گیا ہوا تھا اور راج کُماری بیٹھی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ اِندر جیت کو دیکھ کر اُچھل پڑی۔ اِندر جیت جلدی سے بولا۔ "جلدی کرو۔ باہر گھوڑا تیّار ہے۔ میں تُمھیں لینے آیا ہوں۔" راج کُماری بغیر کُچھ کہے سُنے اُس کے ساتھ ہولی۔

راج کُماری کُسم اُن کا اِنتظار کر رہی تھی۔ اُنہیں آتا دیکھ کر وہ جھٹ پٹ گھوڑے پر سوا ہوئی اور پھِر تینوں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

سارا دن چلنے کے بعد رات کے وقت وُہ بونے کے مُلک کی سرحد میں تھے۔ تب کہیں اُن کی جان میں جان آئی۔

محل میں پُہنچے تو اُنہوں نے دیکھا کہ چھوٹی راج کُماری اِندرا کھانا میز پر رکھے اُن کی راہ تک رہی ہے۔ تینوں کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ مگر جب اُنہوں نے پتھّر کے بُتوں کی طرف دیکھا تو غم زدہ ہو گئے اور ہر ایک نے کھانے سے ہاتھ کھینچ

لیا۔ یہ دیکھ کر بونے کا دِل پسیج گیا اور اُس نے منتر پڑھ کر دونوں کُماروں کو جیتا جاگتا انسان بنا دیا۔ اس کے بعد سب نے خوب مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ بونا بھی اُنہیں خُوش ہوتا دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر خوش گپیاں ہوتی رہی اور پھر بونا اپنے مہمانوں کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ جہاں ایک میز پر سونے کے تین تاج رکھے تھے۔ بوتے نے ایک ایک تاج تینوں راج کُماریوں کو دیا اور بولا۔

"اب آپ لوگ فوراً یہاں سے چلے جایئے۔ اگر اِن دیووں کو خبر ہو گئی کہ آپ میرے پاس ہیں تو میرے شہر پر دھاوا بول دیں گے اور مُجھے خواہ مخواہ اُن سے لڑائی مول لینا پڑے گی۔"

بونا راج کُماروں اور راج کُماریوں کو لے کر کنوئیں پر پُہنچا جہاں ٹوکری اُسی طرح لٹک رہی تھی۔

"جانے سے پہلے میں تمھیں چند نصیحتیں کرتا ہوں، اُمّید ہے تم توجّہ سے سُنو گے۔" بونا بولا۔ "پہلے تو یہ کہ کِسی غریب آدمی کا دِل نہ دُکھانا۔ دُوسرے یہ کہ

تینوں ایک ہی دِن اور ایک ہی وقت میں شادی کرنا۔ تیسرے یہ کہ یہ جو میں نے تُمہیں تاج دیے ہیں اِنہیں کبھی اپنے سے جُدا نہ کرنا ورنہ نتیجے کے تُم خود ذمّہ دار ہوگے۔"

سب نے اُس کا حکم بجالانے کا وعدہ کیا اور کنوئیں میں داخل ہوگئے۔

اِندرجیت نے دُوسرے راج کُماروں اور راج کُماریوں کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اُن کی نیّت میں بدی ہے اور وہ ہم دونوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ وُہ راج کُماری اِندرا سے چُپکے سے بولا۔ "تم اپنا تاج مُجھے دے دو۔ مُجھے تمہاری بہنوں اور اُن کے منگیتروں کی آنکھوں میں بے ایمانی دکھائی دے رہی ہے۔ تُم سب سے آخر میں اور جانا۔ تمہارے بعد میں آؤں گا۔ راج کُماری نے تاج اُس کے حوالے کردیا۔

جب تینوں راج کُمار اور راج کُماریاں اُوپر پُہنچ گئیں تو راج کُماری اِندرا نے زور سے چیخ کر کہا۔ اب میں آ رہی ہوں۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ میرے بعد راج کُمار اندرجیت آئیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ٹوکری میں بیٹھ گئی اور اُوپر پُہنچ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ٹوکری اندرجیت کو لینے آئی تو اُسے فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے بجائے اِس کے کہ خُود ٹوکری میں بیٹھتا ایک بڑا سا پتھّر اُس میں رکھ دیا اور اِنتظار کرنے لگا۔

وہی ہوا جو اِندرجیت نے خیال کیا تھا۔ ابھی ٹوکری آدھ بھر میں پہنچنے نہ پائی تھی کہ رسّی ٹُوٹ گئی اور ٹوکری دھڑام سے نیچے گِر پڑی۔

ساتھ ہی راج کُماری اِندرا کی چیخ سُنائی دی۔ "ہائے، یہ کیا ہُوا!" اِندرجیت دانت پیس کر بولا۔ "کم بخت مُجھے مارنا چاہتے تھے۔ میں نے ہی اِن کی جان بچائی اور میرے ہی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئے۔ خیر چلو۔ آج میں اور یہاں ٹھہر جاؤں۔ وہ تو سمجھتے ہوں گے کہ میرا خاتمہ ہو گیا ہو گا۔"

وُہ واپس بُلانے کے محل میں پُہنچا اور ایک مسہری پر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

صُبح کو وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا تو بونا بولا۔ "اخّاہ آپ؟ آپ پھِر تشریف لے آئے؟"

راج کُمار جلدی سے بولا۔ دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔"

بونا ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "میں سب کُچھ جانتا ہوں۔ آپ کو بتانے کی ضرُورت نہیں۔ اب یہ بتایئے کہ آپ واپس جانا چاہتے ہیں یا اِس خاکسار کے گھر ہی پر دھرنا مارنے کا اِرادہ ہے؟"

"میں اپنے شہر جانا چاہتا ہوں۔" راج کُمار نے جواب دیا۔

"اچھّا تو یہ لیجیے یہ ایک ڈبیا میں آپ کو دیتا ہُوں اِسے جب آپ کھولیں گے تو میں فوراً آپ کی مدد کو پُہنچ جاؤں گا۔ اب آپ آنکھیں بند کر لیں۔"

راج کُمار نے جھٹ آنکھیں میچ لیں اور تھوڑی دیر بعد کھولیں تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک قصبے میں ایک لوہار کی دُکان کے سامنے کھڑا ہے۔ اِس سفر میں اُسے پندرہ روز لگ گئے تھے۔ سارے کپڑے میلے چیکٹ اور جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اُس کی صُورت دیکھ کر ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ کِسی بھٹّی میں کوئلا جھونک کر آ رہا ہے۔ وُہ آہستہ آہستہ چل کر بُوڑھے لوہار کے سامنے جا کھڑا ہُوا جو ایک پھاوڑا بنانے میں مشغُول تھا۔ بُوڑھے نے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور پُوچھا۔ "تُم

کون ہو؟"

راج کُمار بولا۔ "میں ایک غریب آدمی ہُوں۔بھُوکا ہوں۔کُچھ کھانے کو دو۔"

لوہار جھڑک کر بولا۔ "شرم نہیں آتی بھیک مانگتے؟ محنت مزدوری کرو۔ دُنیا میں اِتنا کام ہے کہ تُم آسانی سے اپنی روزی کما سکتے ہو۔" "کہاں جاؤں؟ کِس سے کہوں؟ آپ ہی مُجھے کام دیجیے۔" راج کُمار عاجزی سے بولا۔

"ہاں، یہ بات کی ہے تم نے خُدا لگتی۔" لوہار خُوش ہو کر بولا۔ "تُم آج سے میرے ساتھ کام کیا کرو۔ میں کھانا، کپڑا اور خرچ کے لیے کُچھ پیسے دے دیا کروں گا۔ بولو منظور ہے؟"

راج کُمار نے منظور کر لیا اور وُہ اُس دن سے لوہار کے ساتھ کام کرنے لگا۔

اِندر جیت کو ایک مہینہ لوہار کے ہاں کام کرتے ہو گیا تھا۔ وُہ سوچ رہا تھا کہ کُچھ پیسے پاس ہو جائیں تو اپنی شکل صُورت سنبھال کر گھر جاؤں۔

ایک دِن پڑوس کے گاؤں کا ایک درزی جو لوہار کا بڑا گہرا دوست تھا اور اکثر اُس

کے ہاں آیا کرتا تھا، گاؤں میں آیا۔ یہ درزی جس کا نام گیلانی تھا گپیں ہانکنے میں بڑا مشہور تھا۔ آتے ہی اُس نے اِدھر اُدھر کی خبریں سُنانا شروع کر دیں۔ پھر بولا ”تُم نے سُنا ہو گا کہ ہمارے راجا کی تینوں لڑکیاں اور اُن کے منگیتر عجیب و غریب طریقے سے غائب ہو گئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ اُنہیں پریاں اُٹھا کر لے گئی تھیں۔ ابھی تھوڑے دِنوں کی بات ہے کہ وہ واپس آ گئے ہیں مگر سب سے چھوٹا راج کُمار جِس کا نام اِندر جیت ہے ابھی نہیں آیا۔ دونوں بڑی راج کُماریوں کے پاس سونے کے دو خُوب صُورت تاج ہیں جو اُنہیں پریوں نے دیے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے اُن دونوں کی شادی تھی مگر عین وقت پر ایک عجیب واقعہ ہُوا۔ جانتے ہو کیا؟“

درزی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ لوگوں نے بے صبری سے پُوچھا۔

”ہوا یہ۔“ وُہ بولا۔ ”کہ ایک دم زمین پھٹ گئی اور دونوں راج کُماریاں اور راج کُمار اُس میں سما گئے۔ سب لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد زمین نے اُنہیں باہر پھینک دیا۔ اُس وقت اُن کی صُورت دیکھنے کے قابل

تھی۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا کہ کِسی گندی نالی میں سے نِکل کر آرہے ہیں۔ سارے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے اور چہرے پر بھی گندگی تھپی ہُوئی تھی۔ تمام لوگ چیخیں مارتے ہوئے محل سے بھاگ گئے۔ اِس کے بعد راجا نے اِعلان کیا کہ۔۔۔"

"کیا؟" اِندرجیت نے جلدی سے پُوچھا۔

درزی بولا۔ "راجانے اعلان کیا کہ تینوں راج کُماریوں کی شادی ایک ساتھ ہو گی مگر چُونکہ تیسری راج کُماری کا تاج کہیں کھو گیا ہے اس کے لیے جو شخص اُس کے لیے ویسا ہی تاج بنا کر لائے گا اُسی کے ساتھ اُس کی شادی کر دی جائے گی۔ اب بتاؤ میرے دوست۔" درزی لوہار سے بولا۔ "کیا اِرادہ ہے؟ کیا تُم ایسا تاج بنا سکتے ہو؟"

بوڑھے لوہار نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سر جھُکا لیا۔

درزی چلا گیا تو راج کُمار لوہار سے بولا۔ "بابا تُم راجا کے محل جاؤ اور تاج کا نمونہ اور تھوڑا سا سونا لے آؤ۔ مُجھے یقین ہے کہ میں ایسا تاج بنا لوں گا۔"

بُوڑھا پہلے تو یہ سمجھا کہ لڑکے کا دماغ خراب ہو گیا ہے مگر جب اُس نے بُہت ضِد کی تو مجبوراً وُہ محل پُہنچا اور راجا سے تاج کا نمونہ اور سونا لا کر راج کُمار کے حوالے کیا۔

شام کو راج کُمار بولا۔ "بابا، اب تم سو جاؤ میں تاج بناتا ہُوں۔" یہ کہہ کر وُہ دُکان کو چلا گیا۔ صُبح کو سورج بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ لوہار نے آ کر مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کہو میاں لڑکے تاج تیّار ہو گیا؟" لوہار ہنس کر بولا۔

"جی ہاں۔۔۔ یہ دیکھیے۔"

لوہار نے تاج ہاتھ میں لے کر دیکھا تو اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بالکل ویسا ہی تاج تھا۔ جیسا کہ وہ محل میں دیکھ کر آیا تھا۔ وُہ فوراً محل پُہنچا اور وہ تاج راجا کے حضُور میں پیش کر دیا۔ راجا نے غور سے تاج کو دیکھا تو خُوش ہو کر بولا۔ "خوب خوب، بالکُل ویسا ہی ہے جیسے وُہ دونوں ہیں۔"

"مہاراج۔" لوہار ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں بُوڑھا آدمی ہوں۔ میری زندگی کے دِن

پورے ہو چکے ہیں۔ مجھے اب کسی چیز کی خواہش نہیں۔ مجھے کل خُدا کو مُنہ دِکھانا ہے اِس لیے میں سچ سچ بات بتائے دیتا ہوں۔ اصل میں یہ تاج میں نے نہیں بنایا بلکہ میرے ایک شاگرد نے بنایا ہے۔ وُہ بُہت ہوشیار اور عقل مند نوجوان ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ اُس کا حق اُس کو ملنا چاہیے۔"

راجا نے کُچھ دیر سوچا اور پھر راج کُماری اِندرجیت کو بُلا کر پُوچھا۔ کیا تُم اِس آدمی سے شادی کرنے پر رضامند ہو جس نے یہ تاج بنایا ہے۔ اگرچہ وُہ لوہار ہی کیوں نہ ہو؟"

یہ کہہ کر راجا نے اُس کے ہاتھوں میں وُہ تاج تھما دیا۔ راج کُماری نے اُلٹ پلٹ کر تاج دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں خُوشی کے آنسو اُمڈ آئے۔ یہ وہی تاج تھا جو اُس نے کنوئیں سے نکلتے وقت اندرجیت کو دِیا تھا۔ تاج کو دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ راج کُمار صحیح سلامت ہے اور یہ تاج اُسی نے بھیجا ہے۔

راج کُماری کی رضامندی پا کر راجا نے بڑے راج کُمار کو حکم دیا کہ ایک عمدہ بگھّی لے کر لوہار کے گھر سے اُس نوجوان کو لے آ۔ راج کُمار دِل ہی دِل میں بُرا بھلا کہتا

لوہار کے گھر پُہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک میلا کُچیلا سا نوجوان جس کے ہاتھ پاؤں پر من من بھر خاک دھُول لگی ہوئی ہے، دروازے پر بیٹھا ہے۔

"کیا تُم ہی وُہ شخص ہو جس نے تاج بنایا ہے؟" راج کُمار نے حقارت سے پُوچھا۔

"جی ہاں۔ میں ہی ہوں۔" اِندرجیت نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"اچھّا۔" راج کُمار نفرت سے مُنہ پھیر کر بولا۔ "جلدی سے نہا دھو کر نئے کپڑے بدل لو تمھیں مہاراج نے یاد فرمایا ہے۔"

"میرے پاس اِن کپڑوں کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں۔" اِندرجیت بولا۔ "اگر آپ مُجھے اِسی طرح سے جانے پر تیّار ہوں تو چلا چلتا ہُوں۔"

راجا نے دِل میں سوچا، چلو میرا کیا ہرج ہے دربار میں اِس کی خُوب بے عزّتی ہو گی اور راجا جُوتے لگوا کر نِکال دے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے اِندرجیت کو بگھّی کے اندر بیٹھا لیا۔ راجا کا محل تھوڑی دُور رہ گیا تو اچانک اِندرجیت کو سونے کی ڈبیا یاد آئی۔ اُس نے جیب سے ڈبیا نکالی اور جُونہی اس کا ڈھکنا کھولا بونا اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "کہو

میرے دوست کیا چاہتے ہو؟" اُس نے پُوچھا۔



"سُنو۔" اِندر جیت نے آہستہ سے کہا۔ "تم مُجھے فوراً ہی لوہار کے گھر پُہنچا دو اور بگھّی میں میری بجائے اینٹ پتھّر بھر دو۔"

پلک جھپکنے میں ہی بونے نے اُس کے حکم کے مُطوبق کر دیا اور جب گاڑی محل میں پُہنچی اور اُس کا دروازہ کھولا گیا تو راجہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس میں پتھّر بھرے ہُوئے ہیں۔

"اس کا کیا مطلب؟" راجہ غُصّے سے بولا۔ "تُم مجھ سے مذاق کرنا چاہتے ہو؟ اگر تُم راج کُمار نہ ہوتے تو میں تمہیں وہ سزا دیتا کہ عُمر بھر یاد رکھتے۔"

راج کُمار گردن جھکائے چُپ چاپ کھڑا رہا۔ اُس کی عقل حیران تھی کہ یہ ہُوا کیا؟ تھوڑی دیر بعد جب راجا کا غُصّہ کم ہُوا تو وُہ منجھلے راج کُمار کی طرف مُڑا اور بولا۔ "جاؤ۔ تُم اُس نوجوان کو لے کر آؤ۔"

منجھلا راج کُمار بگھّی میں بیٹھ کر لوہار کے گھر پہنچا اور اِندر جیت کو اپنے ساتھ لے کر محل میں آیا مگر اِس دفعہ بگھّی کا دروازہ کھولا گیا تو اُس میں ریت بجری بھری ہُوئی تھی۔ راجا کے غُصّے کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ زمین پر پیر مار کر بولا۔ "یہ سب احمق اور بے

وقوف ہیں۔ میں خُود جا کر اُسے لاؤں گا۔ فوراً گاڑیاں تیّار کرو۔"

حُکم کی دیر تھی کہ بگھّیاں تیّار ہو گئیں۔ راجا بُہت سے سپاہیوں کے ساتھ لوہار کے گھر پُہنچا اور اِندرجیت کو گاڑی میں سوار کرا کے محل کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں اِندرجیت نے ڈبیا کھولی اور بونے سے بولا۔ "جلدی کرو۔ یہ میلے کچیلے کپڑے اُتار کر مُجھے راج کُماروں جیسے کپڑے پہنا دو۔"

الفاظ اُس کے مُنہ سے ابھی پُوری طرح نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ بونا اُس کا حُکم بجا لایا اور پھر راج کُمار کو سلام کر کے بولا۔

"اچھّا میرے دوست، اب میرا کام ختم ہوا۔ اب میں تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔ الوداع۔" یہ کہہ کر ڈبیا سمیت غائب ہو گیا۔

شاہی جلُوس محل کے دروازے پر پُہنچا تو فوجوں نے سلامی دی اور تمام راج کُماریاں اور رانیاں راجا کے اِستقبال کے لِیے محل کے دریچوں میں آکر کھڑی ہو گئیں۔

سب سے پہلے راجا بگھی میں سے نِکلا اور پھر دروازہ کھول کر اِندرجیت کو اُتارا۔ راج کُمار اُسے زرق برق پوشاک میں دیکھ کر دنگ رہ گئے اور راج کُماری اِندرا خُوشی کے مارے غش کھا کر گِر پڑی۔

رات کو سارے شہر میں چراغاں کیا گیا۔ غریبوں اور مسکینوں میں خیرات تقسیم کی گئی۔ گھر گھر خوشی کے جشن منائے گئے۔

اِندرجیت نے شروع سے اخیر تک سارا قِصّہ راجا کو سُنایا۔ راجا غُصّے سے دانت پیس کر بولا۔ "بیٹا۔ کیا کروں۔ اب تو میں انہیں زبان دے چُکا ہوں۔ ورنہ ابھی اِن کو سولی پہ چڑھوا دیتا۔ خیر، اب تُم بھی اِنہیں مُعاف کر دو۔"

ایک ہفتے بعد تِینوں راج کُماروں اور راج کُماریوں کی بڑے دھوم دھڑاکے سے شادی ہو گئی۔ دُوسرے دِن راجا نے دونوں بڑے راج کُماروں کو اُن کی دُلھنوں سمیت اُن کے مُلکوں کو رُخصت کر دیا۔ اور چھوٹے راج کُمار کو اپنی سلطنت سونپ کر خُود گیان دھیان میں مشغُول ہو گیا۔

اِندرجیت نے سلطنت کا اِنتظام اِس خُوش اسلوبی سے چلایا کہ رعایا اُس پر جان

نِچھاور کرنے لگی۔ اور اِس طرح وہ آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگا۔